مُشکِل اَلفاظ کے مَعانی اور مُفید حاشِیہ کے اِضافہ کے ساتھ

النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ

تدوین وحواشی

عمر أنور بدخشانی

اُستاذ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

زمزم پبلشرز

بسم الله الرحمن الرحیم

النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم

اللهم صل على محمد النبي

الأمي وعلى آله وسلم تسليما

النبی الخاتم

صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

تدوین و حواشی

محمد عمر انور

استاذ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

زمزم پبلشرز

ZAM ZAM PUBLISHERS
Bookseller & Exporters
www.zamzampublishers.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

2011 ۱۴۳۲

شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد، اُردو بازار کراچی
فون: 021-32729089
فیکس: 021-32725673
ای میل: zamzam01@cyber.net.pk
ویب سائٹ: www.zamzampublishers.com

Zam Zam Publishers
Urdu Bazar Karachi-Pakistan.
Ph: 0092-21-32760374
Fax: 0092-21-32725673
E-mail: zamzam01@cyber.net.pk
Website: www.zamzampublishers.com

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

کتبہ
ابن حسرۃ شاہ نفیس الحسینی
ادارہ نفائس القلم لاہور - پاکستان

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ

تم لوگوں کے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا عمدہ نمونہ موجود ہے۔ [سورۃ الاحزاب:۲۱]

وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَّأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ ۚ

(حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا) میں بشارت دینے والا ہوں ایک رسول
کی جو میرے بعد آنے والے ہیں جن کا نام احمد ہوگا۔ [سورۃ الصف:٦]

پیش لفظ

''النبی الخاتم'' سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر اپنے انداز کی ایک منفرد اور نادر کتاب ہے، اکابر اہل علم کی زبانی اس کا تعارف اور خصوصیات آگے آنے والے صفحات میں آپ ملاحظہ فرمالیں گے، مختلف اَدوار میں تحریر کیے جانے والے ان تاثرات میں دو باتیں یکساں طور پر مشترک ہیں:

① مولانا گیلانیؒ نے واقعات سیرت اس انداز سے بیان کیے ہیں کہ ان سے قاری کا ذہن خود بخود عظیم الشان نتائج نکالتا چلا جاتا ہے، اس طرح اس مختصر سی کتاب میں علوم ومعارف کے دریا بند ہیں۔

② یوں معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا دل کی دنیا میں بیٹھ کر عشق کی کیفیت کے ساتھ ایک عجیب انداز سے لکھ رہا ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ کر کے واقعی یہ احساس ہوتا ہے کہ مولانا گیلانیؒ قلم کے بادشاد تھے جیسا کہ حضرت مولانا یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھا ہے:

''چار بزرگوں کے ساتھ اس ناکارہ کو بچپن ہی سے عشق کی حد تک عقیدت ومحبت تھی:

① شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ۔

② امام التبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف دہلوی نور اللہ مرقدہ۔

③ محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری نور اللہ مرقدہ۔

④ ''سلطان القلم'' حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی نور اللہ مرقدہ۔''

[شخصیات وتاثرات ج ۱ ص ۱۳۲]

''النبی الخاتم'' اپنے مخصوص اَدبی اُسلوب، الفاظ کی نُدرت اور اختصار کی وجہ سے ایک عام قاری کے لیے کافی مشکل تھی، کچھ عرصہ قبل زمزم پبلشرز کے روح رواں محترمی مولانا رفیق عبدالمجید صاحب زید مجدہ نے فرمائش کی کہ بیرون ملک کے اردو دان طبقے کی طرف سے اصرار ہے کہ اس معروف ومشہور کتاب کو آسان انداز میں پیش کیا جائے تاکہ اس سے استفادہ عام ہو سکے، چنانچہ ان کی خواہش پر یہ کتاب درج ذیل خصوصیات کے ساتھ پیش خدمت ہے:

① کتاب کے متن میں موجود مشکل الفاظ کے معانی کو قوسین میں اس انداز سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مولانا گیلانیؒ کی تحریر متاثر نہ ہو، پڑھنے والے کی روانی میں بھی خلل نہ آئے اور اس علمی وادبی شاہکار کتاب کا حقیقی حُسن بھی اپنی جگہ برقرار رَہے۔

② مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے گذشتہ مذاہب، تاریخی واقعات وحوادث اور شخصیات کی طرف جا بجا اِشارات وکنایات سے کام لیا ہے حاشیہ میں ان کی وضاحت بھی کردی گئی ہے، اضافہ شدہ حواشی کے آخر میں امتیاز کے لیے بطور علامت [م-ع-ا] درج ہے۔

③ کتاب کی تصحیح قدیم نسخوں کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے، موجودہ مطبوعہ نسخوں میں ایسی غلطیاں بکثرت موجود تھیں جس سے معنی کچھ کے کچھ ہو گئے، مثال کے طور پر موجودہ تمام نسخوں میں ہے:

''ہے کوئی ''مؤید''! جو پوچھنے والوں کی تسلی دوسروں کی شہادتوں سے نہیں''

جبکہ صحیح یوں ہے: ''ہے کوئی ''موبد'' [پارسیوں کا مذہبی پیشوا]! جو پوچھنے والوں کی تسلی دوسروں کی شہادتوں سے نہیں''۔

یہ! اور اس جیسی دیگر کئی غلطیوں کی اصلاح کر دی گئی ہے۔

④ آغاز کتاب میں قارئین کی دلچسپی کے لیے ''النبی الخاتم'' کے بارے میں بعض اکابر اہل علم وتحقیق کے ذاتی احساسات وتاثرات کو بھی شامل کیا گیا ہے جن سے اس کتاب کی اہمیت، افادیت اور وقعت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سرورق پر کتاب کا نام سید انیس الحسینی مرحوم (فرزند رئیس الخطاطین حضرت سید نفیس شاہ الحسینی رحمۃ اللہ علیہ) کا لکھا ہوا ہے جس کے لیے میں محترمی جناب فیصل صاحب (الفیصل، لاہور) کا بے حد ممنون ہوں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے، آمین۔

محمد عمر انور

۲۷ رجب ۱۴۳۲ھ

فہرستِ مضامین

پیش لفظ 7

فہرست مضامین 10

اہل علم کے تاثرات 13

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ 14

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ 15

ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمۃ اللہ علیہ 16

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی 17

مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ 19

النبی الخاتم 24

دیباچہ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ 25

مکی زندگی 27

والدین کی وفات 54

عبدالمطلب کی کفالت اور ان کی وفات 55

ابوطالب کی کفالت 55

دائی حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا 56

ملک عرب 57

قریش اور قریش کی حالت 58

ایام طفولیت اور شغل گلہ بانی 59

حجر اسود کا جھگڑا 61

نکاح 62

خلوت پسندی 65

ابتداء وحی 68

تعذیب صحابہ رضی اللہ عنہم 72

ہجرت حبشہ 73

نجاشی کے دربار میں جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی تاریخی تقریر 75

ذات مبارک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایذا رسانیوں کا آغاز 78

ابو طالب کو توڑنے کی کوشش 79

شعب ابی طالب 81

شعب ابی طالب کے مصائب کی قیمت واقعہ معراج 82

واقعہ معراج کے متعلق چند ارشادات 83

حضرت ابو طالب اور خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات 87

طائف کو روانگی 87

طائف سے واپسی 91

جبرائیل امین کا ظہور طائف کی راہ میں 94

جنوں سے ملاقات اور بیعت 99

مدینہ والوں سے پہلی ملاقات 100

انصار مدینہ کی پہلی ملاقات 102

دار الندوہ کا آخری فیصلہ اور ہجرت 109

سفر ہجرت کا آغاز اور اس کے واقعات 110

سفر ہجرت میں سراقہ سے گفتگو 114

مدنی زندگی 117

بناء مسجد وصفہ 119

تحویل قبلہ کا راز 120

مواخاۃ اور اس کا فائدہ 122

اذان کی ابتدا 124

تبلیغ عام کا آغاز 125

مشکلات راہ 125

غزوہ بدر 127

عہد نبوت کے جہاد میں شہداء اور مقتولوں کی

ایک ہزار اٹھارہ تعداد 129

بیرون عرب میں تبلیغ کا کام 133

اسلامی جہاد کی ترتیب 137

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن 138

مدینہ میں دنیا کے مذاہب کا اکھاڑہ 138

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حیثیت 144

ختم نبوت 152

فریضہ امت محمدیہ 161

ضمیمہ: نقشہ متعلق ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن 165

ضمیمہ: عہد نبوت کے تمام شہداء، مقتولین،

مجروحین اور اسیروں کی فہرست 166

النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

اہلِ علم کے تاثرات

تاثرات

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

''النبی الخاتم'' ایک گلدستہ عقیدت ہے جسے مولانا مناظر احسن کے عقیدت مند قلم نے سجایا ہے، اس میں مولانا نے اپنے خاص والہانہ رنگ میں سیرت پاک کے واقعات کو ایک خاص انداز وترتیب کے ساتھ پیش کر کے نہایت لطیف نتائج پیدا کیے ہیں، اس حیثیت سے یہ اپنے طرز میں منفرد ہے کہ تاریخی واقعات کو وارفتگی بیان کے ساتھ اس طرح نبھایا گیا ہے کہ ناقد مؤرخین اور اَربابِ وَجد وحال دونوں اپنے اپنے ذوق کے مطابق لطف اٹھا سکتے ہیں، زبان صاف وسادہ لیکن صنائع لفظی سے مالا مال ہے۔

[معارف، اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۵۷ء]

تاثرات

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا کی تصنیفات میں سے غالباً سب سے پہلے "النبی الخاتم" پڑھی، کتاب عجیب البیلے انداز میں لکھی گئی ہے، صحف سماوی کا انداز بیان، خطیبوں کا جوش و برجستگی، عشاق کی مستی اور وارفتگی، عقل و جذب کی لطیف آمیزش، حسب معمول معمولی اور مشہور واقعات سے لطیف نکتے اور عظیم نتیجے نکالتے چلے جاتے ہیں اور وہ اس سرعت و کثرت کے ساتھ کہ پڑھنے والا مصنف سے شکایت کرنے لگتا ہے کہ:

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

میں نے اپنی ساری عمر میں سیرت نبوی میں "رحمۃ للعالمین" اور "النبی الخاتم" سے زیادہ مؤثر کتاب نہیں پڑھی، کتاب پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف علم وانشاء پردازی کی کرشمہ سازی نہیں ہے، اس کے اندر ان کا سوزِ دروں اور خونِ جگر بھی شامل ہے اور واقعہ یہی ہے کہ:

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

ان سے جب زیادہ ملنا ہوا اور کچھ دن ساتھ رہنا ہوا تو اس حقیقت کی تصدیق ہوئی اور حیدرآباد کے قیام میں خود انہوں نے اپنے بعض واقعات سنائے جن سے بارہ گاہ رسالت سے خصوصی تعلق و مناسبت اور اس کتاب کی مقبولیت و تاثیر کا راز معلوم ہوا۔

[الفرقان لکھنو، افادات گیلانی نمبر ۱۹۵۷ء، پرانے چراغ، ج ۱، صفحہ ۶۷]

تاثرات

ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمۃ اللہ علیہ

سیرت نگاری میں ایک نیا اسلوب جو بیسویں صدی میں پیدا ہوا وہ سیرت کا ادیبانہ اسلوب تھا، ہمارے دور میں یہ انداز شروع ہوا اور اُردو کے علاوہ خود عربی میں بھی اس انداز کی کتابیں لکھی گئیں، اس موضوع پر سب سے دلچسپ اور البیلی کتاب جو ادبی انداز سیرت کا بہت عمدہ نمونہ ہے وہ برصغیر کے ایک بزرگ مولانا مناظر احسن گیلانی کی ایک کتاب ہے، مولانا نے ''النبی الخاتم'' کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی تھی، اس میں نہ واقعات میں کوئی ترتیب ہے، نہ بظاہر اس میں کوئی نئی تحقیق ہے، لیکن پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا لکھنے والا دل کی دنیا میں بیٹھ کر ایک عجیب انداز سے لکھ رہا ہے، میں اس کتاب کا ایک جملہ سنا کر بات ختم کر دیتا ہوں، مسجد نبوی کے فرش پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سونے یعنی آرام فرمانے کا ذکر ہے، لکھتے ہیں کہ:

> ''خاک کے فرش کے سوا جس کے پاس کوئی فرش نہیں، وہ اگر خاک پر سویا تو کیا خاک سویا، جو تخت پر سوسکتا ہے وہ مٹی پر سویا، اسی کا سونا ایسا خالص سونا ہے جس میں کھوٹ نہیں ہے''۔

[محاضرات سیرت صفحہ ۶۸۹]

تاثرات

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ

مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی لکھی ہوئی یہ انوکھی سیرت اَب پڑھے لکھے طبقے میں تعارف کی محتاج نہیں رہی، خود راقم الحروف نے اسے بار بار پڑھا اور ہر بار نیا لطف محسوس کیا ہے، سیرت طیبہ کے اہم واقعات کا ایک نقشہ پہلے سے ذہن میں موجود ہو تو اس کتاب کے مطالعے کا صحیح لطف آتا ہے، مولاناؒ نے واقعات اس انداز سے بیان کیے ہیں کہ ان سے قاری کا ذہن خود بخود عظیم الشان نتائج نکالتا جاتا ہے، اس طرح اس مختصر سی کتاب میں علوم و معارف کے دریا بند ہیں، ایک مثال:

> ''جن پر تلوار چلائی گئی وہ نہیں، بلکہ جنہوں نے تلوار چلائی، انہوں نے مسلمان ہو کر ان جھوٹوں کو جھٹلایا، جنہوں نے بازاروں میں پھیلایا تھا کہ جو کچھ پھیلایا گیا تلوار کے زور سے پھیلایا گیا''۔

اور زبان کی روانی، شوکت اور جوش و خروش کا تو یہ عالم ہے کہ بار بار پڑھ کر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی، کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

> ''یوں آنے کو تو سب ہی آئے، سب میں آئے، سب جگہ آئے (سلام ہو ان پر) کہ بڑی کٹھن گھڑیوں میں آئے، لیکن کیا

کیجئے ان میں جو بھی آیا جانے کے لئے آیا، پر ایک اور صرف ایک، جو آیا اور آنے ہی کے لئے آیا، وہی جو آنے کے بعد پھر کبھی نہیں ڈوبا، چمکا اور چمکتا ہی چلا جا رہا ہے، بڑھا اور بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے، چڑھا اور چڑھتا ہی چلا جا رہا ہے.......... جو پچھلوں میں بھی اس طرح ہے جس طرح پہلوں میں تھا.......... جو آج بھی اسی طرح پہچانا جاتا ہے اور ہمیشہ پہچانا جائے گا جس طرح کل پہچانا گیا تھا کہ اسی کے اور صرف اسی کے دِن کے لئے رات نہیں، ایک اسی کا چراغ ہے، جس کی روشنی بے داغ ہے"۔

پوری کتاب کا انداز یہی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پوری کتاب ایک ہی نشست اور ایک ہی دُھن میں لکھ دی گئی ہے، پھر اس اُسلوب بیان کے ساتھ صرف سیرت ہی کے نہیں بلکہ دوسرے مذاہب کے بارے میں بھی بڑی علمی بحثیں چھیڑی گئی ہیں، بلاشبہ یہ کتاب اردو کے علمی وادبی ذخیرے کی ایک قیمتی متاع ہے۔

[البلاغ، ذی القعدہ ۱۳۸۸ھ]

تعارف

مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

سیرت طیبہ نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ) کے باب میں تصانیف اور مقالات کی اب کمی نہیں، اور اگر یہ کہا جائے تو بالکل مبالغہ نہ ہوگا کہ آج تک کسی علمی، تاریخی یا ادبی موضوع پر اتنی کتابیں تصنیف نہیں کی گئیں جتنی کہ ''سیرت محمدی'' اور اس کے متعلقات پر چھپ چکی ہیں اور اب تو یہ کیفیت ہے کہ کوئی مہینہ بلکہ غالباً کوئی ہفتہ اور کوئی دن بھی ایسا نہیں گزرتا جس میں اس مقدس موضوع پر کوئی کتاب، کوئی رسالہ یا کوئی مقالہ کہیں سے اشاعت پذیر نہ ہوتا ہو اور ہونا بھی یہی تھا کیونکہ ''رفعِ ذکر'' ازل کی طے شدہ الٰہی تجویز ہے۔

لیکن اس شیوع اور اس بے انتہا کثرت کے باوجود ایسی کتابیں اس بے پایاں ذخیرہ میں گنتی کی چند ہی نکلیں گی جن میں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی جامعیت اور اکملیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہو جو اس کا طغرائے امتیاز ہے، بالخصوص اس سلسلہ کی چھوٹی اور متوسط کتابیں تو اس چیز سے اکثر خالی ہی ہیں اور فی الحقیقت یہ ہے بھی بہت مشکل کہ گنتی کے چند ورقوں میں ''نبی خاتم'' کی اس سیرت مقدسہ کو جو قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے اسوہ ہے جامعیت کے ساتھ پیش کیا جاسکے۔

لیکن الحمدللہ پیش نظر کتاب اس حیثیت سے انہی چند مستثنیات میں سے ہے، وہ اختصار کے باوجود ''سیرتِ نبویہ'' کے تمام قابل غور پہلوؤں پر حاوی ہے، بلکہ جن پہلوؤں کو

سطح بین دنیا نے قابل غور نہیں سمجھا، اور اس لئے ہمیشہ ان پر سرسری طور سے گزر گیا، ان کو بھی اس کتاب میں ''قابل غور'' بنا کر پیش کیا گیا ہے جیسا کہ ان کا حق تھا، اور بہت سے ان معلوم ومشہور واقعات سے جو ''حیات نبوی'' کے معمولی سوانح ہی کی حیثیت سے لوگوں کے ذہنوں اور حافظوں میں محفوظ ہیں نہایت گہرے، دوررس اور پھر بالکل صحیح نتائج نکالے ہیں، بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ اس خصوص میں یہ چھوٹی سی کتاب بالکل عدیم النظیر ہے، جدید تحریک ''سیرت'' کے بانی جناب عبدالحمید صاحب قریشی ایڈیٹر اخبار ''ایمان'' (جنہوں نے مصروشام وہند کے مشاہیر سے درجنوں مقالے اور مضامین اس موضوع پر لکھوائے ہیں اور خود یہ کتاب ''النبی الخاتم'' بھی ابتداءً انہی کی تحریک پر ایک مقالہ کی صورت میں لکھی گی تھی) انہوں نے اس کے متعلق لکھا تھا اور بالکل صحیح لکھا تھا کہ:

''سیرت کی لائبریری میں اس قسم کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔''

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ یہ کتاب اگرچہ ''سیرت'' پر لکھی گئی ہے جو تاریخ ہی کا ایک شعبہ ہے لیکن مصنف کا مقصد اس سے صُرف ''سوانح نبویہ'' کی تدوین نہیں ہے، اور اسی لئے واقعات میں تاریخی ترتیب کا التزام نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ان کا مطمح نظر اس میں تبلیغ اور دعوت اِلی الحق ہے، انہوں نے حیاتِ نبوی کے ہر حادثہ اور سانحہ کو صاحب سوانح صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا برہان، اور آپ کے پیغام کا مصدق بنا کر پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، مگر چونکہ کسی وجہ سے انتہائی ایجاز واختصار ان کے پیش نظر ہے اس لئے انہوں نے جابجا تصریحات کا کام صرف اشارات ورموز سے لیا ہے اور جب کہ اس سے پہلے ایڈیشن میں عنوانات بھی نہ تھے تب تو غالباً عام ناظرین پوری طور پر ''مافیہ'' کو سمجھ بھی نہیں سکتے ہوں گے لیکن اب آپ نے قریباً ہر پیرے پر عنوان قائم کر کے اپنے ''رموز وکنایات'' کی بڑی حد تک تشریح کردی ہے اور ان عنوانات کی روشنی میں کتاب کو دیکھنے

کے بعد اب حیرت ہوتی ہے کہ گنتی کے ان چند ورقوں میں اس بندہ خدا نے کیا کیا بھر دیا تھا اور کس طرح بھر دیا تھا؟ دریا بکوزہ کی مثال بہت مشہور ہے، لیکن شاید دنیا کی کسی اور کتاب پر وہ اس سے بہتر طور سے صادق نہ ہو!۔

میرا اندازہ ہے اور ان شاء اللہ غلط نہیں، کہ اگر انہیں مضامین کو عام نگارش کے طرز پر لکھا جاتا اور انہی دعاوی و دلائل کو عام استدلالی ترتیب سے مرتب کیا جاتا تو ایسی ایسی کم از کم چار پانچ جلدوں میں یہی مضامین مشکل سے سماتے لیکن محترم مصنف کے مخصوص طرزِ تحریر نے ان تمام وسیع الذیل مباحث و مضامین کو اس چھوٹی سی کتاب میں سمیٹ دیا ہے جو یقیناً بڑا کمال ہے۔

ناظرین کو کتاب سے قریب کرنے کے لئے (جو اس تعارف کا مقصد ہے) کتاب اور اس کے مصنف کی ایک اور خصوصیت کا ذکر بھی ناگزیر ہے، علم و تحقیق کی وسعت یا گہرائی اور اپنی معلومات کو خوبصورتی کے ساتھ دل نشین طریقہ پر بیان کر دینا یا تحریر میں لے آنا یہ وہ کمالات ہیں جن میں بڑی حد تک کسب کو بھی دخل ہے۔ لیکن ''عشق'' کی آگ اور دل کا ''سوز وگداز'' وہ دولت ہے جو صرف خدا کی دین پر موقوف ہے، پھر جب وہ ''کمال'' اور یہ ''خدا داد، دولت'' کہیں جمع ہو جائیں اور دونوں مل کر کسی ''صاحب محبوبیت کبریٰ'' کی تصویر تیار کریں تو جیسی کچھ تیار ہو گی ظاہر ہے۔

''النبی الخاتم'' کے محترم مصنف انہی خوش نصیبوں میں سے ہیں جنہیں ''علم و تحقیق'' اور تقریر و تحریر کے کمال کے ساتھ اس ''وہبی نعمت'' سے بھی حصہ وافر ملا ہے اور اس لئے اس کتاب میں غیر قصدی بلکہ شاید غیر شعوری ہی طور پر کہیں کہیں ''حال'' کا رنگ بھی آ گیا ہے جس نے ''علم و تحقیق'' کے ساتھ مل کر ایک خاص کیف پیدا کر دیا ہے اور جی چاہتا ہے کہ ان مقامات کو بار بار مزے لے لے کر پڑھا جائے، اگرچہ اس ''حال'' اور ''تحقیق'' کی

آمیزش نے بعض جگہ تعقید بھی پیدا کردی ہے لیکن سرمستانہ جوشِ بیان کی لذت ان جگہوں پر بھی تعقید کی کلفت محسوس نہیں ہونے دیتی، یہاں تک پہنچ کر جی چاہتا ہے کہ اس کتاب اور اس کے ''صاحب نعت'' مصنف کے متعلق ایک خاص بشارت جو اب تک میرے سینے میں ''سرِمکنوں'' کی طرح محفوظ رہی اس کو بھی ظاہر کردوں۔ اگر صاحب کتاب کو میری یہ جسارت اور یہ ''اِفشاءِ راز'' ناگوار ہوتو وہ مجھے معاف فرمادیں۔

مجھ سے ایک نہایت ثِقہ بزرگ نے بیان کیا تھا کہ جن دنوں یہ کتاب (النبی الخاتم) تصنیف ہورہی تھی ایک صاحب دل بزرگ نے ایک رات عالم واقعہ میں دیکھا کہ حضرت خاتم النبیین رحمۃ للعالمین (ﷺ) اپنے جمال کی پوری تابشوں کے ساتھ رونق افروز ہیں اور مولانا گیلانی قدموں میں تڑپ رہے ہیں لیکن ان سے نظر بچائی جارہی ہے، صاحب واقعہ بزرگ نے یہ دیکھ کر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے (جو وہیں موجود تھے) عرض کیا کہ اس بیچارے کو ایک نظر کیوں نہیں دیکھ لیا جاتا؟ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

''اس کو اگر دیکھ لیا گیا تو مرجائے گا''

میرے نزدیک یہ مقدس صحبت اور یہ تڑپ اس مبارک تالیف کی صورت مثالیہ اور اس کے مصنف کے پرسوز جذبات کی تصویر تھی:

بریں مژدہ گر جاں فشانند رواست
ہزار عمر فدائے دمے کہ من از شوق
بخاک و خود تپم و گوئی از برائے من است

آخر میں کتاب کے متعلق دو باتیں اور بھی عرض کرنی ہیں، اس کتاب میں مصنف نے آنحضرت ﷺ کی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کردیا ہے، مکی زندگی کو انہوں نے

دل کی زندگی اور مدنی زندگی کو دماغ کی زندگی قرار دیا ہے، میرے علم میں یہ بالکل نئی مگر نہایت صحیح تقسیم ہے، فی الحقیقت نبوت کے بعد مکہ کی بارہ تیرہ سالہ زندگی میں جن کمالات کا ظہور ہوا ان کا زیادہ تر تعلق ملکات قلبیہ ہی سے تھا اور مدنی زندگی میں جو امور مہمہ انجام پائے ان کے لئے دماغی صلاحیت وقابلیت اور فکر وتدبیر ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو حضرات اس کتاب کو صرف ایک نظر دیکھیں گے وہ شاید پورا استفادہ نہ کرسکیں گے اور نہ اچھی طرح لطف اندوز ہوسکیں گے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ گہری نظر سے اس کو ایک سے زیادہ مرتبہ دیکھا جائے، خود میں نے بھی اس کو دو مرتبہ بالاستیعاب اور بعض مقامات کو اس سے بھی زیادہ دفعہ دیکھا ہے اور ہر مرتبہ ''قند مکرر'' کا لطف اٹھایا ہے۔

والسلام

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

ماہ رحمت ربیع الاول (۱۳۵۸ھ)

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

انا آخر الانبیاء

و

انتم آخر الامم

صدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: میں نبیوں میں سب سے آخری نبی ہوں
اور تم امتوں میں سب سے آخری امت ہو۔ [کتاب الفتن، سنن ابن ماجہ]

دیباچہ

اگر چہ اس کتاب کا بلکہ مختصر سے ''رسالہ یا مقالہ'' کا تعلق ''سیرت طیبہ'' (علی صاحبها الف الف سلام وتحیة) سے ہے لیکن ارادۃً اس میں ''سیرت'' کے واقعات کو تاریخی ترتیب کے ساتھ بیان کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے بلکہ بجائے ''واقعات'' کے صرف ''نتائج'' سے بحث ایک خاص نقطہ نظر کو پیش رکھ کر کی گئی ہے ایسے حضرات جو سیرت کی کتابیں پڑھ چکے ہیں یا کسی ذریعہ سے ان کے مضامین سے واقف ہیں اور بحمد اللہ مسلمانوں میں ایسوں کی کمی نہیں، ان کے لئے تو کسی ہدایت کی ضرورت نہیں ہے مگر خدانخواستہ کسی کو اگر اس کا موقع میسر نہ آیا ہو تو اردو زبان میں اس کا کافی ذخیرہ موجود ہے، خصوصاً پچھلے چند سالوں میں قاضی سلیمان مرحوم منصور پوری نے ''رحمۃ للعالمین'' چودھری نواب علی صاحب نے تذکرۃ المصطفیٰ ''سیرۃ الرسول'' ڈاکٹر عبدالحکیم مرحوم نے ''النبی والاسلام'' اور آخر میں علامہ شبلی مرحوم اور ان کے جانشین برحق مولانا سید سلیمان ندوی نے ''سیرۃ النبی ﷺ'' کے ذریعہ سے اردو زبان کو ''مضامین سیرت طیبہ'' سے مالا مال کر دیا ہے تا آنکہ دوسری اسلامی زبانوں کو بھی اردو کی اس جامع شگفتہ اور مستند کتاب کا ترجمہ کرنا پڑا۔

اس سلسلہ میں صاحب ایمان ''قریشی'' صاحب کی کوششوں کو بھی ایک امتیاز

حاصل ہے اور یہ ''مقالہ'' بھی ان ہی کی فرمائش سے لکھا گیا، ان ہی بزرگوں کی محنتوں کا نتیجہ ہے کہ آج اردو زبان میں سب سے زیادہ آسان تصنیف گویا ''سیرۃ نبویہ'' کی تدوین ہے، شاید ہی کوئی مہینہ ایسا گزرتا ہو جس میں اس موضوع پر بلند اور معمولی معیار پر ہر طرح کے رسائل اور کتابیں شائع نہ ہوتی ہوں جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان مخلصوں کی پاک نیت نے ملک کے مذاق پر کافی اور گہرا اثر پیدا کیا ہے۔

بہرحال میری غرض فقط اس قدر ہے کہ بجائے واقعات کے صرف نتائج پر مطلع ہونے کے لئے یہ رسالہ جو چوتھی بار شائع ہو رہا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ مسلمانوں اور شاید نامسلمانوں کے لئے بھی مفید ثابت ہوگا۔

إن أريد إلّا الإصلاح ما استطعت وما توفيقي إلّا بالله عليه توكلت وإليه أنيب.

سید مناظر احسن گیلانی

مکّی زندگی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین وسلام علی المرسلین

یوں آنے کوتو سب ہی آئے، سب میں آئے، سب جگہ آئے (سلام ہو ان پر) کہ بڑی کٹھن گھڑیوں میں آئے، لیکن کیا کیجئے ان میں جو بھی آیا جانے کے لئے آیا، پر ایک اور صرف ایک، جو آیا اور آنے ہی کے لئے آیا، وہی جو آنے کے بعد پھر کبھی نہیں ڈوبا، چمکا اور چمکتا ہی چلا جارہا ہے، بڑھا اور بڑھتا ہی چلا جارہا ہے، چڑھا اور چڑھتا ہی چلا جارہا ہے، سب جانتے ہیں اور سبھوں کو جاننا چاہئے کہ جنہیں کتاب دی گئی اور جو نبوت کے ساتھ کھڑے کئے گئے، برگزیدوں (مقبولوں) کے اس پاک گروہ میں اس کا استحقاق (حق) صرف اسی کو ہے اور اس کے سوا کس کو ہوسکتا ہے جو پچھلوں (بعد والوں) میں بھی اس طرح ہے جس طرح پہلوں میں تھا، دُور والے بھی اس کو ٹھیک اسی طرح پا رہے ہیں اور ہمیشہ پاتے رہیں گے جس طرح نزدیک والوں نے پایا تھا، جو آج بھی اسی طرح پہچانا جاتا ہے اور ہمیشہ پہچانا جائے گا جس طرح کل پہچانا گیا تھا کہ اسی کے اور صرف اسی کے دِن کے لئے رات نہیں، ایک اسی کا چراغ ہے، جس کی روشنی بے داغ ہے، ورنہ جنہوں نے ناموں کو کھویا، کیا وہ اپنے ہادیوں کے کاموں کی نگہبانی کرسکتے تھے۔

ہمارے ملک میں وید[1] کی صورت میں اوتاروں[2] کا کام پیش کیا جاتا ہے لیکن لا پرواؤ! تم سے جب ان کے ناموں کا بھی بوجھ نہ اٹھایا گیا تو ہمیں کیا دکھاتے ہو کہ یہ ہے ان کے کاموں کا پشتارہ (بوجھ)! تاریخ کے تحقیقی ہاتھوں نے ہندوستان کے رہنماؤں اور ان کی امتوں کے درمیان جو اندھیری کھائیاں کھودی ہیں اور مسلسل کھدتی چلی جارہی ہیں، کیا اب آدمی کے بس میں ہے کہ ان کو پاٹے (ہموار کرے)؟ کن پر اتری؟ کہاں اتری؟ کن کن زبانوں میں اتری؟ نظم میں اتری کہ نثر میں اتری؟ صدیوں میں اتری، جگوں[3] (زمانوں) میں اتری؟ جب ان تمام بنیادی سوالات پر، ایسے سوالات پر جن کی تحقیق کے بغیر کسی چیز کے ہونے نہ ہونے کا فیصلہ اٹکا ہوا ہے، تم خود جانتے ہو، کہ ان پر اندھیرا چھایا ہوا ہے بتاؤ کہ شک کی ان دلدلوں میں یقین کا قدم کس طرح اٹھایا جائے؟[4]

تم ان سے اوجھل ہو، وہ تم سے اوجھل ہیں، پھر کس راہ سے تم ان کو تاکو گے (دیکھو گے) جن کو تاک کر تم چلنا چاہتے ہو اور کس طرح وہ اپنے تئیں تمہیں دکھائیں جو اپنے دکھا کر تمہیں چلانا چاہتے ہیں۔

---

[1] ''وید'' ہندومت کے مذہبی کتب کے مجموعے کا نام ہے جو ممکنہ طور پر آٹھویں صدی قبل مسیح کے دوران ضبط تحریر میں لائی گئیں، قدیم ہندوستان کے بارے میں تمام تر معلومات ویدوں کی ہی مرہون منت ہیں متعدد ویدوں میں سے صرف چار وید باقی رہ گئے ہیں: ① ریگو وید (حمد و ستائش کے گیتوں کا علم) ② سام وید (نغموں کا علم) وہ موزوں شدہ گیت جو برہمن قربانی اور دینی مراسم کی ادائیگی کے وقت پڑھا کرتے تھے۔ ③ یجور وید (قربانی کے طریقوں کا علم) دعا، اوراد، اور عبادتوں کا مجموعہ۔ ④ اتھر وید (جادو ٹونے کے قاعدے اور منتروں کا علم)۔ [م-ع-ا]

[2] اوتار (Avtar) کے معنی خدا کی جانب سے اتارا ہوا ہے، خدا یا دیوتا کا انسانی شکل میں آکر لوگوں کی اصلاح کرنا، مگر ہندومت میں عموماً اوتاروں کو خدا (بھگوان) سے علیحدہ بشر نہیں بلکہ خود خدا ہی کا روپ قرار دیا جاتا ہے، یعنی بھگوان خود کسی شکل میں وارد ہوتا ہے۔ [م-ع-ا]

[3] ہنود کے مجوزہ چار زمانوں (ست جگ، تریتا جگ، دواپر جگ اور کل جگ) میں سے ہر ایک زمانہ ''جگ'' کہلاتا ہے۔ [م-ع-ا]

[4] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا عنوان سنسکرت وید

ہوسکتا ہے کہ بدھ اور بدھ مت [1] والوں نے تم کو ان سے توڑا ہو، حالانکہ سچ یہ ہے کہ بدھ سے بہت پہلے بھارت ورش (بھارت کا علاقہ) [2] اور اس کے بچے اپنے اوتاروں (خداؤں) سے ٹوٹ چکے تھے لیکن اپنی غلطی دوسروں پر اڑھانے کے لئے اس کی تہمت بدھ ہی کے ذمہ جوڑی گئی [3]، مگر سوال یہ ہے کہ جن کو بدھوں نے اپنے بزرگوں سے توڑا، کیا ٹھیک اسی کے توڑ پر انہوں نے بدھ شٹوں کو بدھ کے قدموں پر چھوڑا؟ اور آج اگر ویدک دھرم (ویدوں کا مذہب) کے حقیقی سرچشموں کا دنیا کو سراغ نہیں ملتا تو کیا بجنسہٖ اسی طرح یقین کے ساتھ کوئی مہاتمابدھ کے اصلی نوشتوں (تحریر) اور واقعی بچنوں (فرمودات) کا کہیں نشان دے سکتا ہے؟ ویدک دھرم اگر بالمیک [4] کے قصوں اور

---

[1] بدھ مت مذہب جس کی زیادہ تر تعلیمات کی بنیاد "سدھارتھ گوتم" کی طرف منسوب ہیں، چھٹی صدی قبل مسیح میں کپل وستو کے راجا شدھودھن کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام سدھارتھ رکھا گیا، یہ عام طور پر "بدھا" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، دنیا کے معروف مذاہب میں سے ایک "بدھ مت" بھی ہے۔ [م-ع-ا]

[2] انڈیا کا تاریخی نام جو سنسکرت ادب میں ملتا ہے وہ "بھرت ورش" یا "بھرت کھنڈ" ہے جو کہ راجہ بھرت کے نام پر رکھا گیا ہے، ہندوؤں کی ایک مذہبی کتاب "پران" کے مطابق ایک معروف راجہ بھرت یا بھارت نے شمال کے سات علاقوں کو متحد کر کے ایک مملکت قائم کی اور وہ مملکت ایک بڑی طاقت بن کر علاقے میں ابھری، اس دور میں راجہ بھرت کا مقبوضہ علاقہ جو کہ موجودہ بھارت سے کافی چھوٹا تھا کا نام جمبودویپا تھا اور اس راجہ کے مرنے کے بعد ہندوؤں نے اس علاقے کو بھرت ورش (بھرت کا علاقہ) کہنا شروع کیا۔ موجودہ بھارت اسی بھرت کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ [م-ع-ا]

[3] بدھ مت اور ہندو مت کے درمیان شدید اختلاف اور لڑائی رہی اور کہا جاتا ہے کہ بنیادی طور پر بدھ مت، ہندو مت کی تعلیمات کا ردعمل ہے، سدھارتھ گوتم بدھ نے جب دیکھا کہ پرانا ویدک دھرم ذات پات کے بندھنوں کی وجہ سے ناقابل برداشت ہو چکا ہے تو اس نے اس مذہب کے خلاف آواز بلند کی، اس نے کہا کہ شودر اور برہمن میں کوئی فرق نہیں، سب انسان ہیں اور ان کے حقوق برابر ہیں، مہاتما بدھ کی تبلیغ سے دیکھتے ہی دیکھتے ہندو دھرم کی جڑیں کھوکھلی ہو گئیں۔ [م-ع-ا]

[4] ہندوؤں کی مقدس کتاب رامائن کے مصنف کا نام مہارشی گورو بالمیک سوامی ہے، رامائن سنسکرت لفظ ہے بمعنی رام کی سرگزشت، سنسکرت کی ایک طویل رزمیہ نظم جس میں ہندوؤں کے اوتار رام چندر جی کے حالاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ [م-ع-ا]

مہابھارت [1] کے افسانوں پر قائم ہے تو اَوہام (خیالات) کے جس مجموعے کا آج بدھ مت نام ہے، کیا تحقیق کی نگاہ میں اس کی قیمت بھی اختراعی (جھوٹی گھڑی ہوئی) کہانیوں سے زیادہ ہے؟ آج کس مؤرخ کے ذخیرے میں ایسا تیل ہے جس کے چراغ کی روشنی میں کپل وستو [2] کا منی اسی شان میں نظر آئے جیسا کہ واقع میں تھا۔

---

[1] مہابھارت ہندوستان کی قدیم اور طویل ترین منظوم داستان جنگ ہے جو کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان کروکشیتر کے مقام پر ہوئی تھی اور اٹھارہ روز جاری رہی تھی، اسے ہندومت کے مذہبی صحائف میں معتبر حیثیت حاصل ہے۔ [م-ع-ا]

[2] بدھ مت کے بانی سدھارتھ گوتم بدھ کو "کپل وستو" بھی کہا جاتا ہے یعنی کپل والا، "کپل وستو" دامن ہمالیہ کے اس شہر کا نام تھا جہاں بدھ پیدا ہوا تھا اور اس کے باپ کا یہی شہر اس کے باپ راجا شدھودھن کا پایہ تخت بھی تھا، یہ شہر بدھ کا دارالحکومت بھی تھا، قرآن مجید میں انبیاء صالحین کے ذکر میں ایک ذوالکفل کا بھی آیا ہے، مفسرین کا خیال ہے "وفی تسمیته ذو الكفل أقوال مضطربة لاتصح" [روح المعانی ص ۷۲ ج ۱۷] ذوالکفل کے نام میں مختلف اقوال ہیں اور ان میں کوئی بات صحیح نہیں ہے، کیا اس صورت میں اگر کفل کو کپل کا معرب ٹھہرا کر یہ کہا جائے کہ "کپل والا" ذوالکفل کے معنی ہیں، جیسا کہ بعض کا خیال ہے، تو روایۃً اس کے رد کرنے کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے، مذہبی دنیا کا اتنا عظیم انقلابی وجود جیسا کہ بدھ تھا قرآن میں اگر اس کا ذکر ہو تو کیا تعجب ہے، خصوصاً اسلام سے اس کا جو تعلق ہے، جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ [گیلانی]

[مولانا گیلانی کی مذکورہ رائے جمہور علمائے امت کے خلاف ہے، چنانچہ مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ لکھتے ہیں کہ: "ایک دوسرے معاصر کی عجیب رائے یہ ہے کہ ذوالکفل "گوتم بدھ" کا لقب ہے اس لیے کہ اس کے دارالسلطنت کا نام "کپل" تھا"۔ آگے لکھتے ہیں: "ہم اس تعصب کے قائل نہیں ہیں کہ اگر صحیح تاریخ سے یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن نے جن انبیا کے صرف نام ذکر کیے ہیں ان کا مصداق فلاں برگزیدہ ہستی ہے تو صرف اس لیے انکار کر دیا جائے کہ اس سے قبل ایسی بات چونکہ کسی نے نہیں کہی اس لیے قابل رد ہے۔ مزید لکھتے ہیں: "پس اگر قرآن عزیز کی بیان کردہ کسی ہستی کے متعلق مزید اکتشافات روشنی میں آئیں تو ہمارے لیے باعث انکار نہیں بلکہ مخالفین و معاندین پر مزید حجت ودلیل ہیں، لیکن اس اقرار حقیقت کے باوجود اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ کسی واقعہ کے متعلق اگر ایک شخص محض اپنے مزعومہ قیاس و تخمین سے بے دلیل کوئی دعوی کر دے تو ضرور اس کو مان لیا جائے چنانچہ ذوالکفل کو گوتم بدھ قرار دینا بھی تک اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔"]

(قصص القرآن ج ۲ صفحہ ۵۲۵) [م-ع-ا]

اور آرین دھرم [1] کی ہندی شاخ کی بربادی کا الزام تو بدھوں یا جینیوں [2] کے سر تھوپا جاتا ہے لیکن ایران کی سرزمین میں وہ آگ کس نے لگائی جس میں زرتشت اور اس

---

[1] آریائی ادیان وہ مذاہب ہیں جن کی ابتدا آریائی قوم میں ہوئی، آریائی ان اقوام کو کہا جاتا ہے جو تقریباً اڑھائی ہزار سال قبل مسیح وسط ایشیا سے چراگاہوں کی تلاش میں نکلیں اور ایران کو پامال کرتی ہوئی برصغیر پاک و ہند میں وارد ہوئیں اور یہاں کی قدیم مہذب قوموں کو جنوب کی طرف دھکیل کر خود ملک پر قبضہ کر لیا، آریاؤں کے کچھ قبیلوں نے یورپ کا رخ کیا اور وہاں جا کر آباد ہو گئے، آریہ سفید رنگ، دراز قد اور بہادر تھے کردار کی بلندی اور تنظیم کی صفات ان میں موجود تھیں، ابتداء میں ان کا پیشہ گلہ بانی تھا جو رفتہ رفتہ کھیتی باڑی میں تبدیل ہو گیا، نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے، دودھ، مکھن، سبزیاں، اور اناج عام خوراک تھی، میلوں اور تہواروں میں مرد عورتیں آزادانہ شریک ہوتے تھے، سورج، آگ، پانی، بادل اور دیگر مظاہر قدرت کی پوجا کی جاتی تھی، دیوتا کو خوش کرنے کے لیے جانوروں کی قربانی کا رواج تھا۔

آریائی مذاہب کو دو اقسام میں بانٹا جاتا ہے: (۱) ویدک (۲) غیر ویدک

ویدک مذہب کو عام طور پر ہندومت اور برہمنیت کے نام سے پکارا جاتا ہے جبکہ غیر ویدک مذاہب میں سکھ مت، بدھ مت اور جین مت وغیرہ شامل ہیں۔ [م-ع-ا]

دیکھو ''ہندوستانی تہذیب ازمنہ وسطیٰ میں'' شائع کردہ ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد، بیان بدھ مت اور جین مت، دراصل اس کے لئے میری کتاب ''الکتاب'' کا انتظار کیجئے، جس میں قرآن کی تاریخی استواری و وثاقت کا مقابلہ دیگر ادیان کی بنیادی کتابوں کی روایتی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ یہ قرآن کے پہلے جملہ ﴿ذلك الكتاب لا ريب فيه﴾ کی تفسیر ہے۔ [گیلانی]

[2] جین مت بھی بدھ مت کا ہم عصر مذہب ہے، یہ ہندومت میں پائی جانے والی ذات پات کے نظام کے خلاف ہے، ''مہاویر'' اس مذہب کے بانیوں میں اہم مقام رکھتا ہے، مہاویر کے زمانے سے ہی اس میں دو فرقے بن گئے تھے، ایک دگمبر دوسرا شویتامبر، بھارت کے صوبے گجرات میں ان کی اکثریت ہے جبکہ بمبئی میں ان کی تعداد بیس لاکھ سے زائد ہے، جین مت خدا کی ہستی کو تسلیم نہیں کرتا، ان کا کہنا ہے کہ جو بڑا ہے وہی انسان کی روح میں پائی جانے والی طاقت خدا ہے، دنیا میں ہر چیز جاودانی ہے، روحیں جسم بدل بدل کر آتی ہیں مگر اپنی الگ ہستی کا احساس باقی رہتا ہے، نروان یعنی روح کی مادے اور جسم سے رہائی نویں جنم کے بعد ممکن ہو سکتی ہے، نروان (روح کی سمسار) یعنی جنموں کے سلسلہ سے آزادی حاصل کرنے کو ''نروان'' حاصل کرنا کہتے ہیں، جانوروں کا ہلاک کرنا، درختوں کو کاٹنا، حتی کہ پتھروں کو توڑنا، ان کے نزدیک گناہ ہے۔ [م-ع-ا]

کے سارے کارنامے ہمیشہ کے لئے جل کر بھسم ہو گئے، آج جب بیچارے زرتشت[1] کے وجود میں بھی شک پیدا کیا جاتا ہے اور مورخین کی اکثریت کو اس وجود کو فرضی اور وہمی ثابت کرنے پر اصرار ہے تو انصاف کرو کہ اس کے لائے ہوئے دین کا اب کون اقرار کرسکتا ہے۔[2]

''گاتھا''[3]! کیا تھی؟ کہاں تھی؟ کس زبان میں تھی؟

ہے کوئی موبد (پارسیوں کا مذہبی پیشوا) جو پوچھنے والوں کی تسلی دوسروں کی شہادتوں سے نہیں اپنی خانگی (ذاتی) گواہیوں سے کرسکتا ہو! ''گاتھا'' کے شروح وتراجم، ''اوستا''[4]

---

[1] آتش پرستوں کا پیغمبر جس نے آتش پرستی کا دین ایجاد کیا، زرتشت ایران کا قدیم مذہب ہے جس کے ماننے والے پارسی اور مجوسی بھی کہلاتے ہیں، زرتشت ثنویت کا قائل تھا، اس کا دعوی تھا کہ کائنات میں دو طاقتیں (دو خدا) کارفرما ہیں: ① ایک ''اہورا مزدا'' (یزداں) جو خالق اعلیٰ اور روح حق وصداقت ہے جسے نیک روحوں کی اعانت حاصل ہے اور ② دوسری ''اہرمن'' جو بدی، جھوٹ اور تباہی کی طاقت ہے، اس کی مدد بدروحیں کرتی ہیں، ان دونوں کی ازل سے ابد تک کشمکش جاری رہے گی، جب یزداں کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے تو دنیا امن وسکون کا گہوارہ بن جاتی ہے اور جب اہرمن غالب آجاتا ہے تو دنیا فسق وفجور اور اس کے نتیجے میں آفات ارضی وسماوی کا شکار ہو جاتی ہے، یزداں کے لیے آگ کو بطور علامت استعمال کیا جاتا ہے کیوں کہ ان کے نزدیک یہ ایک پاک وطاہر شے ہے اور دوسری چیزوں کو بھی پاک وطاہر کرتی ہے، پارسیوں کے معبدوں اور مکانوں میں ہر وقت آگ روشن رہتی ہے اسی لیے انہیں آتش پرست بھی کہا جاتا ہے۔ [م-ع-ا]

[2] دیکھو ''فجر الإسلام''، ڈاکٹر طہ حسین مصری۔

[3] ''گاتھا'' زرتشت (پارسی، مجوسی) مذہب کی مقدس کتاب 'اوستا' کے ابتدائی حصے کا نام ہے۔
[م-ع-ا]

[4] ''اوستا'' پارسی مذہب کی مقدس کتاب کا نام ہے، کہتے ہیں کہ اس کے اکیس اجزا تھے جو بارہ ہزار چمڑوں پر سنہرے خط میں لکھے ہوئے تھے، سکندر اعظم نے 331 ق م ایران فتح کیا تو اوستا کا زیادہ حصہ ضائع ہو گیا، ساسانیوں کے عہد میں پراگندہ اوستا کو جمع کیا گیا تو 348 فصلیں مل سکیں جنھیں اکیس اجزا میں منقسم کیا گیا، اس وقت فقط ایک مکمل جز ''وندیداد'' موجود ہے، ان کے بارے میں عام عقیدہ یہی ہے کہ یہ زرتشت کا کلام ہے۔ [م-ع-ا]

اور ''ژنداوستا'' [1] کا نام بلاشبہ باقی ہے لیکن اس کی اِکیس سورتوں سے بجز ایک سورۃ کے جس پر موجودہ آتش کدوں اور ان کے رسوم کی بنیاد ہے اگر غیروں میں نہیں تو کیا اس پر ایمان لانے والوں کے یہاں بھی کوئی سورۃ پائی جاتی ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا ہے، جو جانے ہی کے لئے آئے تھے وہ آ کر جب چلے گئے تو اب ان کی تلاش میں لوگ کیوں سر گرداں ہیں؟

اب ان لکیر پیٹنے والوں سے کوئی ہوتا جو کہتا کہ سانپ نکل چکا ہے لکڑیاں ٹوٹیں، ٹوٹتی چلی جائیں گی، ہاتھ شل ہوں گے اور ہوتے چلے جائیں گے لیکن سانپ نہیں مرے گا۔

مرگھٹوں [2] پر نالہ (شور) کرنے والو! دخموں [3] پر واویلا مچانے والو! سن لو! جو جانے کے لئے یہاں آتا ہے، چلے جانے کے بعد پھر یہاں واپس نہیں ہوتا، اس دنیا کی رِیت (روایت) یہی ہے، پھر جو جا چکے ان پر تم کب تک روؤ گے؟ اور یہ حال تو ان کا ہے جن کے پاس کچھ نہیں ہے، ہر پچھلے (بعد والوں) کے لئے پہلوں کے گانٹھے (تیار کیے) ہوئے منصوبے ان کے دین بن جاتے، دھرم (مذہب) ان کے یہاں صرف اسی شخص کی بات ہے جو ان سے پہلے اس دنیا میں ہو یا اٹھارہویں صدی والوں نے جو خیالی

---

[1] زرتشت کی دینی کتاب اوستا کی تشریح کا نام ''پاژنداوستا'' ہے، زرتشت کی کتاب اس وقت کی ''زند'' (قدیم فارسی) زبان میں تھی۔ کچھ عرصے بعد ایران پر دوسری قوموں کا غلبہ ہوا اور نئے فاتحین کی زبان وہاں رائج ہوئی۔ پرانی زبان متروک ہوتی گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ ملک بھر میں مٹھی بھر عالم اور متخصص کے سوا ''زند'' زبان جاننے والا کوئی نہ رہا اس لیے مجوسی مذہب کے بڑوں نے نئی زبان ''پاژند'' میں اس کتاب کا خلاصہ اور شرح لکھی۔ [م-ع-ا]

[2] ''مرگھٹ'' جہاں ہندو اپنے مردے جلاتے ہیں، شمشان گھاٹ،۔ [م-ع-ا]

[3] ''دخمہ'' ان کنوؤں اور عمارتوں کا نام ہے جن میں پارسی اپنے مردوں کو سلاخوں میں ٹیک لگا کر اس لئے کھڑا کر دیتے ہیں کہ گدھیں چیلیں انہیں نوچ کر کھا جائیں، اس خاص عمارت کو ''منارِ خاموشی'' بھی کہا جاتا ہے۔

من پلاؤ (بے بنیاد خوش فہمی) پکایا، انیسویں صدی والوں کے لئے یہی دینی غذا ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ ۱۰ عیسوی میں وسوسوں کا جال بنایا گیا ۲۰ء میں وہی نجات کی کشتی بن جاتی ہے اور یہ کیفیت ان کی ہے جن کے پاس اپنے بزرگوں کے نام کے سوا کام کا کوئی تنکا بھی باقی نہیں، لیکن وہ جن کا دعویٰ مذہب کے میدان میں سب سے اونچا ہے، جنہوں نے اپنا نام ہی کتاب والا (اہل کتاب) رکھا ہے، کیا واقعی جن کتابوں کا پشتارہ (بوجھ) اپنی پیٹھوں پر لادے لادے وہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں مارے مارے پھرتے ہیں، یہی یہودی اپنی کتابوں کی راہ سے ان موسیٰ علیہ السلام کو پا سکتے ہیں جن کی زندگی سے وہ اپنی زندگی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

مصریوں کی غلامیوں میں صدیاں کاٹنے والے بنی اسرائیل کے آوارہ گرد صحرانوردوں (جنگلوں میں پھرنے والوں) کو جب خدا کے پیغامبر موسیٰ علیہ السلام آسمانی تختیاں سونپ کر کے موآب (بحرمیت کی مشرقی جانب) کی سرزمین میں بحالت مسافرت آسودہ (مطمئن) ہوئے، سب جانتے ہیں کہ ان میں اس وقت یعقوب کے گھرانے کے بارہ اَسباط (قبیلے) اور خانوادے شریک تھے، یہی بارہ اسباط تھے، جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی کا محافظ ونگران ٹھہرایا تھا، لیکن ان بارہ سبطوں میں سے دو ایک نہیں پورے دس اَسباط کو جب نینوا کے نمرود شلما نصر اور اس کے بیٹے سرگون نے شامرون [1]

---

[1] شامرون یا شامرہ عبرانی تلفظ ہے چونکہ عربی زبان میں شین کو سین سے تبدیل کر دیا جاتا ہے، چنانچہ عربی میں اس کو سامرہ پڑھا جاتا ہے، جیسے کہ یشوع، شموئیل اور موشی کو عربی میں یسوع، سموئیل اور موسیٰ پڑھا جاتا ہے، جادوگر سامری بھی اسی شہر کی طرف منسوب ہے، ۷۲۱ قبل مسیح میں اشور کے سخت گیر فرمانروا سارگون نے سامریہ کو فتح کر کے دولت اسرائیلی کا خاتمہ کر دیا، ہزارہا اسرائیلی تہ تیغ کیے گئے، ۲۷ ہزار سے زیادہ با اثر اسرائیلیوں کو ملک سے نکال کر اشوری سلطنت کے مشرقی اضلاع میں تتر بتر کر دیا گیا اور دوسرے علاقوں سے لا کر غیر قوموں کو اسرائیل کے علاقے میں بسا گیا جن کے درمیان رہ بس کر بچا کھچا اسرائیلی عنصر بھی اپنی قومی تہذیب سے روز بروز زیادہ بیگانہ ہوتا چلا گیا۔ [م-ع-۱]

کے شہر سے نکالا۔ ؎۱

جو ذبح ہوئے، جو قتل ہوئے، جو جلائے گئے زن و مرد، بچوں، بوڑھوں کی ان لاکھوں کی تعداد کو چھوڑ کر جن بے کسوں کو زنجیروں میں جکڑ کر رسیوں میں باندھ کر سرگون نے ایشیا کی شمالی و مشرقی کوہستانوں میں جنگلی جانوروں کی طرح کھدیڑ دیا (شکار کیا) تو کیا دنیا نہیں جانتی کہ اسرائیل کی ان کھوئی ہوئی بھیڑوں نے اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو، ان کی کتاب کو دنیا کے کسی حصہ میں پھر کبھی بھولے سے بھی یاد کیا؟

ہوں گے، شامرون کے بن باسی (جنگل کے رہنے والے) اسرائیلی ہوں گے، دنیا کی ان ہی قوموں میں ہوں گے، جو ایشیا کے شمالی مشرقی حصوں میں آباد ہیں، لیکن کیا ہندوستان کے برہمن اپنے اسرائیلی ہونے پر فخر کر سکتے ہیں؟ افغانستان کے باشندے یہودی ہونے کی گالی برداشت کر سکتے ہیں؟ سندھیوں اور بلوچستانیوں میں کوئی یہ یقین پیدا کر سکتا ہے کہ وہ شامرون ہی کے یہودیوں کی نسل سے ہیں؟ مارواڑ کے سودی کاروبار کرنے والے ساہوکاروں کو کوئی باور کرا سکتا ہے کہ ان کے اَجداد فلسطین کے رہنے والے تھے، وہ موسیٰ علیہ السلام سے بچھڑ گئے اور یہی ان کے لئے مقدر تھا، آخر بے کسوں کا یہ مرحوم قافلہ اپنے ساتھ اپنے ان فاقہ زدہ ڈھانچوں کے سوا اور کیا رکھتا تھا؟ جن کے ساتھ ان کی جانیں اٹکی ہوئی تھیں یا لوہے کی وہ

؎۱ بنی اسرائیل کے یہ دس اسباط کہاں گم ہو گئے، مؤرخین کا اس کے متعلق مختلف خیال ہے، عام رجحان یہی ہے کہ افغانستان اور سرحد کی پہاڑیوں میں رہنے والے شاید یہی لوگ ہیں جنھوں نے پہلے بدھ مذہب اور اخیر میں اسلام قبول کیا۔ درہ خیبر کوہ سلیمان وغیرہ، اس میں قرائن کے سوا ان کی شکل وصورت عادات واطوار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، نیز توراۃ کا کوئی حصہ بھی سرحدی قبائل میں کسی مؤرخ کو ملا تھا، خود بھی ان میں بعض اپنے آپ کو اسرائیلی کہتے ہیں، پشتو زبان کے الفاظ میں بھی اس کے قرائن ہیں، اسی طرح بعضوں کا خیال ہے کہ سندھ میں شامرونی تمدن کے آثار جو ملتے ہیں، وہ شامرون کے ان ہی اسرائیلیوں کے ہیں، بعض لوگ راجپوتانہ کے مارواڑی ساہوکار اور ہندوستان کے برہمنوں کو اسرائیلی قرار دینا چاہتے ہیں۔

زنجیریں اورسن [1] کی وہ رسیاں جن میں وہ جکڑے ہوئے اپنے گھروں سے نکالے گئے۔

''موسوی شریعت''، ''موسوی سیرت'' کی حفاظت کی بڑی قوت اس طرح دنیا کی دوسری قوتوں میں کھپ گئی، اب دینی میثاق کا سارادارومدار اسرائیل کے محض ان دوسبطوں کے بچے کھچے لوگوں پر رہ گیا جو فلسطین کے جنوبی علاقے میں آباد تھے، اگرچہ عملاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی شریعت سے وہ بھی دور ہو چکے تھے لیکن اِسماً پھر بھی قریب تھے۔

پر جو جانے کے لئے آیا تھا اس کے جانے کی آخری گھنٹی بھی بجادی گئی، آنے والے کی روانگی کا وقت آگیا، اشوری [2] برباد ہوئے، بابل آباد ہوا، اسی بابل کا مشہور نمرود بخت نصر آندھی کی طرح اٹھا، بادل کی طرح چڑھا اور پھر صاعقہ (آسمانی بجلی) بن کر گرا، اِسرائیل کے ان دو پسماندہ سبطوں پر ﴿فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ﴾ [3] جس کی تفسیر میں یہودی اور غیر یہودی ہر قسم کے مورخین کا بیان ہے:

''پوری قوم بنی اسرائیل کو مع زن وفرزند گرفتار کرایا، خانہ خدا کی

---

[1] ایک پودا جس کی چھال سے رسیاں بنتی ہیں۔ [م-ع-ا]

[2] تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح، شمالی عراق میں دریائے دجلہ وفرات کے درمیان فروغ پانے والی ایک قدیم تہذیب وسلطنت جو اپنے دورِ عروج میں مصر، شام، لبنان، آرمینیا، ایلم (جنوب مغربی ایران) اور بابل تک پھیلی ہوئی تھی۔ ابتداء میں اس کا دارالسلطنت شہر اشور تھا، اسی کے نام پر اسی سلطنت کا نام اشوریہ پڑا، بعد میں اشوری فرماں رواؤں نے شہر نینوا کو دارالسلطنت بنایا اور وہاں عظیم الشان محل، معابد اور دیگر عمارات تعمیر کیں، شاہ اشور بنی پال کی وفات کے بعد سلطنت اشوریہ کا زوال شروع ہوا اور 612 ق م میں اہل بابل نے نینوا پر قبضہ کر کے اشوری سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ صرف اس کا نام اسیریا (اشوریہ) یونانی لفظ (سیریا) کی شکل میں باقی رہا۔ جو اب شرق اوسط کے ایک جدید ملک (شام) کا نام ہے۔ [م-ع-ا]

[3] قرآن کی آیت ہے جس میں اسرائیلیوں کی تباہی کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے ملک میں زور آور قوتیں گھس پڑیں۔

تمام چیزیں لوٹ لیں، سلیمان کی بنائی ہوئی مقدس عمارت کو کھود کے زمین
کے برابر کر دیا، سارا شہر منہدم کر ڈالا، گرد کی فصیل گرادی، ہر جگہ آگ
لگادی، ہر چیز جلا کے خاک سیاہ کر ڈالی" (تاریخ یہود مؤلفہ عبدالحلیم شرر ص ۶۱)

اور یہ ان کے شہر اور ملک کا حال ہوا، خود موسیٰ علیہ السلام اور ان کی کتاب کے آخری نگرانوں پر کیا گزری؟:

"ساری قوم بنی اسرائیل کی گرفتار ہو کے بابل روانہ ہوئی،
بخت نصر یہودیوں کے بادشاہ صدقیاہ کو بھی اپنے ساتھ پکڑ لے گیا اور
بابل میں پہنچنے کے بعد اس کے بیٹے اس کی آنکھوں کے سامنے طرح
طرح کے عذابوں سے قتل کئے گئے اور یہ جگر پاش منظر دکھانے کے ساتھ
ہی اس کی آنکھیں پھوڑ ڈالی گئیں تا کہ پھر خوشی کی چیز نہ دیکھ سکے۔

(کتاب مذکور ص ۶۱)

یہودیوں کا بادشاہ اندھا کیا گیا اور یہودی اگرچہ زندہ رکھے گئے، لیکن کیسی زندگی؟:

"سخت محنت اور جفاکشی میں رہتے اور اپنی حالت کو یاد کر کے
روتے، انہیں اپنی مذہبی رسموں کو بجا لانے کی ممانعت تھی، نہ قربانی
کر سکتے تھے، نہ روزے رکھ سکتے تھے۔" (کتاب مذکور ص ۱۶)

عملاً وہ اس طرح موسوی شریعت کی رسوم سے بھی جدا کئے گئے اور یہودیوں کا جو کتابی سرمایہ تھا، اس کے متعلق تاریخ کی یہ اتفاقی (متفقہ) شہادت ہے:

"توراۃ مقدس اور قدیم آسمانی صحف انبیاء کا کہیں پتہ نہ تھا،
اس لئے کہ بابل والوں کے طوفان بے تمیزی نے ان کی قدیم تاریخ اور

اگلے اسرائیلی لٹریچر کے ساتھ ان مقدس کتابوں کو بھی فنا کر دیا تھا۔“

(کتاب مذکور ص ۵۹)

اسرائیل کے یہی دو سبط (قبیلے) موسوی دین کے آخری سہارا تھے سو ٹوٹ کر پاش پاش ہو گیا۔

یہ سچ ہے کہ غلامی کی اس رُسوا زندگی اور اسیری (قید) کی ان ذلیل گھڑیوں سے اولادِ یعقوب کو ایک مدت کے بعد نجات میسر آئی، اس وقت نجات میسر آئی جب اسیر ہونے والے زندگی کی قید سے آزاد ہو چکے تھے اور صرف ان کے وہ بچے رہ گئے تھے جنہوں نے اس ملک میں آنکھیں کھولیں تھیں، جہاں ان کے مذہب کی تعلیم ممنوع تھی اور مذہبی رسوم کی بجا آوری (ادائیگی) جرم ٹھہرائی گئی تھی، لیکن اپنے ماں اور باپ کی نالہ وبکا (رونے پیٹنے) کے شور میں ان کے کانوں تک آواز پہنچی تھی کہ وہ بھی کسی دین کے وارث اور خدا کے کسی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ودیعت (امانت) کے پاسبان ہیں۔

گریہ وواویلا (رونے اور شور مچانے) کی ان آوازوں کا یہ اثر تھا کہ جب (سائرس) شاہ ایران نے نمرود عراق کی حکومت کا تختہ الٹ کر اسرائیلیوں کو بھی آزادی بخشی تو ان کی ایک بڑی جماعت ہانپتے ہانپتے راکھ کے اس ڈھیر پر پہنچی جو سلیمان وداؤد کے شہر و ہیکل کے جلانے کے بعد یروشلم کے میدانوں میں پڑی ہوئی تھی، یہودیوں کے قافلے کے پہلے دن گویا رونے اور پچھتانے ہی کے نذر ہوئے تا ایں (یہاں تک) کہ وہ قافلہ بھی آگیا جس میں دین کے غم خوار وہ اسرائیلی نوجوان ”عزرا“ یا عزیر علیہ السلام بھی تھے، ان کے یاد دلانے پر لوگوں کو موسیٰ کی اس کتاب کا خیال آیا جو نہ دنیا میں کاغذ کے اوراق پر موجود تھی اور نہ بابل کی زندانی (قید خانے کی) زندگی میں پیدا ہونے والے یہودیوں کے دماغ میں اس کا کامل

کیا بلکہ ناقص سا بھی کوئی ہلکا سا خاکہ موجود نہ تھا۔ [1]

الٹا گیا، خاکستر (راکھ) کا وہی تودہ (ڈھیر) الٹا گیا، کہا جاتا ہے کہ راکھ اور کوئلہ کے اسی ڈھیر کے نیچے کسی تہ خانہ کے اندر سے عزیر علیہ السلام کو تورات کا وہ نسخہ ہاتھ آیا، جس کی

---

[1] حضرت یعقوب علیہ السلام نے وحی الٰہی کے مطابق مسجد بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) کی بنیاد ڈالی اور اس کی وجہ سے بیت المقدس آباد ہوا، پھر عرصہ دراز کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے مسجد اور شہر کی تعمیر اور تجدید کی گئی، اس لیے یہودی مسجد بیت المقدس کو ہیکل سلیمانی کہتے ہیں، ہیکل سلیمانی اور بیت المقدس کو 586 ق م میں شاہ بابل بخت نصر نے مسمار کر دیا تھا اور ایک لاکھ یہودیوں کو غلام بنا کر اپنے ساتھ عراق لے گیا، بیت المقدس کے اس دور بربادی میں حضرت عزیر علیہ السلام کا وہاں سے گذر ہوا، انہوں نے اس شہر کو ویران پایا تو تعجب ظاہر کیا کہ کیا یہ شہر پھر کبھی آباد ہوگا؟ اس پر اللہ نے انہیں موت دے دی اور جب وہ سو سال بعد اٹھائے گئے تو یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ بیت المقدس پھر آباد اور پر رونق شہر بن چکا تھا، بخت نصر کے بعد 539 ق م میں شہنشاہ فارس روش کبیر (سائرس اعظم) نے بابل فتح کر کے بنی اسرائیل کو فلسطین واپس جانے کی اجازت دے دی، یہودی حکمران ہیرود اعظم کے زمانے میں یہودیوں نے بیت المقدس شہر اور ہیکل سلیمانی پھر تعمیر کر لیے، یروشلم پر دوسری تباہی رومیوں کے دور میں نازل ہوئی، رومی جرنیل ٹائٹس نے 70ء میں یروشلم اور ہیکل سلیمانی دونوں مسمار کر دیے، 137 ق م میں رومی شہنشاہ ہیڈرین نے یہودیوں کو بیت المقدس اور فلسطین سے جلاوطن کر دیا، چوتھی صدی عیسوی میں رومیوں نے عیسائیت قبول کر لی اور بیت المقدس میں گرجے تعمیر کیے۔

پہلی جنگ عظیم دسمبر 1917ء کے دوران انگریزوں نے بیت المقدس اور فلسطین پر قبضہ کر کے یہودیوں کو آباد ہونے کی عام اجازت دے دی۔ یہود و نصاریٰ کی سازش کے تحت نومبر 1947ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے دھاندلی سے کام لیتے ہوئے فلسطین عربوں اور یہودیوں میں تقسیم کر دیا اور جب 14 مئی 1948ء کو یہودیوں نے اسرائیل کے قیام کا اعلان کر دیا تو پہلی عرب اسرائیل جنگ چھڑ گئی، اس کے جنگ کے نتیجے میں اسرائیلی فلسطین کے 78 فیصد رقبے پر قابض ہو گئے، تاہم مشرقی یروشلم (بیت المقدس) اور غرب اردن کے علاقے اردن کے قبضے میں آ گئے، تیسری عرب اسرائیل جنگ (جون 1967ء) میں اسرائیلیوں نے بقیہ فلسطین اور بیت المقدس پر بھی تسلط جما لیا، یوں مسلمانوں کا قبلہ اول ہنوز یہودیوں کے قبضے میں ہے، یہودیوں کے بقول 70ء کی تباہی سے ہیکل سلیمانی کی ایک دیوار کا کچھ حصہ بچا ہوا ہے جہاں دو ہزار سال سے یہودی زائرین آ کر رویا کرتے تھے اسی لیے اسے ''دیوار گریہ'' کہا جاتا ہے، اب یہودی مسجد اقصیٰ کو گرا کر ہیکل تعمیر کرنے کے منصوبے بناتے رہتے ہیں، اسرائیل نے بیت المقدس کو اپنا دارالحکومت بھی بنا رکھا ہے۔ [م-ع-ا]

حفاظت اسرائیل کے دو اسباط اس طرح کرتے چلے آرہے تھے کہ یہودیوں کے گھروں میں نہیں بلکہ ہیکل میں صرف اس کا ایک نسخہ رہتا تھا جسے ساتویں سال یہودی اس طرح سُن لیا کرتے تھے جس طرح آج دنیا کے مسلمان ہر سال تراویح کی شکل میں ہر شہر اور ہر گاؤں میں قرآن کا سننا ضروری سمجھتے ہیں۔

راکھ کے نیچے کا یہی نسخہ تھا جو کسی نہ کسی طرح خدا کی قدرت سے جیسا کہ یہود کہتے ہیں آگ کے ان شعلوں سے محفوظ رہ گیا تھا، جس نے سلیمان کی ہیکل کا تنکا تنکا جلا کر خاک کر دیا تھا، جو بعد میں ان تمام نسخوں کی اصل قرار پایا، جنہیں آئندہ یہودیوں نے اپنی نجات کا ذریعہ ٹھہرایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام تک پہنچنے کی ساری راہیں جب قطعی طور پر بند ہو چکی تھیں اس وقت خاکستری نسخہ کا ایک سوراخ نکل آیا، جس سے جہاں تک ممکن تھا یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پھر دیکھ سکتے تھے، لیکن زمانہ نے اس سوراخ کو بھی زیادہ دن تک کھلا نہ رکھا اور ایک دفعہ نہیں، بار بار ہر سو، دو سو سال کے بعد کبھی یونان سے کبھی روم سے ایسے جبار (ظالم) اٹھے جو رہ رہ کر اس سوراخ کو بند کر دیتے تھے اور یہودی کھول دیتے تھے، (انطاکیہ کا بادشاہ) انٹونیس یونانی نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پھر توراۃ کے نسخوں کو جلا کر دنیا سے ناپید کیا، ہیکل کو پھر زمین سے برابر کر کے اس کی جگہ جوپیٹر[1] کا مندر بنایا لیکن باوجودیکہ انٹونیس کا یہ خونی

---

[1] جوپیٹر (Jupitor) لاطینی لفظ ہے، قدیم یونانی دیومالا میں جوپیٹر (زیوس) خداؤں کا خدا سمجھا جاتا تھا، ان کا خیال تھا کہ اس کے پاس، بہت زیادہ آگ یا روشنی کے چراغ ہیں، ہر صبح اس آگ یا چراغوں میں سے ایک آسمان کی طرف بھیجتا ہے تاکہ زمین کو روشن اور گرم رکھے اور جس وقت ختم ہو کر راکھ بن جاتی ہے یا چراغ میں تیل نہیں رہتا تو وہ غروب ہو جاتا ہے اور خاموش چراغ وہاں گرتے ہیں جہاں تک کسی کی رسائی نہیں، یعنی زیوس خداؤں کا خدا ہر دن ایک سورج کو آسمان پر بھیجتا تھا، قدیم یونانیوں نے ستاروں کے مسائل کو اپنے لئے آسمان بنا دیا تھا اور ہر چیز کی وضاحت زیوس (Jupitor) کے فیصلوں اور کاموں سے کرتے تھے، ان کے نزدیک وہ کوہ اولمپس کا حاکم، طوفان اور آسمانی بجلی کا مالک بھی تھا۔ [م-ع-ا]

حکم تھا کہ: ''جس کے پاس توراۃ کا ایک ورق بھی ملے وہ مارا جائے''، تاہم یہودی کہتے ہیں کہ مقابی یہودی بادشاہ کے زمانے میں انہوں نے پھر اس کتاب کو زندہ کر لیا[1]، انٹونیس کے بعد رومی قہرمان (غضب ناک) طیطس[2] کا فتنہ آگ کی طرح اٹھا، اس نے گیارہ لاکھ یہودیوں کو قتل کیا، ہیکل اس کے سپاہیوں کے ہاتھوں نذر آتش ہوا، توراۃ پھر دنیا سے جل کر ناپید ہوئی، لیکن یہودی کہتے ہیں: ''انہوں نے کسی نہ کسی ذریعہ سے اسے پھر پیدا کر لیا''، حالانکہ تورات بجز ہیکل یا شاہی خزانہ کے اور کہیں نہیں رہتی تھی، طیطس کے بعد روم کے قیصر ہیڈرین[3] نے پھر پانچ لاکھ یہودیوں کو ذبح کر کے ان کی کتاب کے ساتھ وہی کیا جو پہلوں نے کیا تھا، اس نے بھی جوپیٹر کا دیوتا اسی جگہ قائم کیا، جہاں کبھی سلیمان علیہ السلام نے اللہ کی مسجد بنائی تھی، اس نے یروشلم کا نام بدل کر ایلیاہ رکھ دیا، آغاز اسلام تک بیت المقدس

---

[1] کہا جاتا ہے کہ عزرا نبی نے تورات یعنی سلسلہ اول کی پانچ کتابوں کو از سر نو مرتب کر کے واقعات کو مؤرخانہ حیثیت سے قلم بند کیا۔ عزرا نے ان کتابوں (اسفار) کو کس مواد سے از سر نو مرتب کیا تھا' تاریخ اس پر کچھ روشنی نہیں ڈالتی، عزرا کے بعد نحمیاہ نبی نے سلسلہ دوم کی چھوٹی بڑی بائیس کتابوں کو جمع کیا، اس کے بعد فلسطین کی طرف یونانیوں کا سیلاب آیا اور 168 ق م میں انٹونیس (انطاکیہ کے یونانی بادشاہ) نے مقدس صحیفوں کو جلوایا، اس کے بعد یہودا مقابی کی ہمت اور مدد سے مقدس صحیفوں کو از سر نو جمع کیا گیا اور اس مرتبہ پہلے دو سلسلوں کے ساتھ سلسلہ سوم کی بارہ کتابوں کا بھی اضافہ کیا گیا۔ [م-ع-ا]

[2] ۶۶ء میں یہودیوں نے رومی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی جس کو کچلنے کے لیے رومی جنرل طیطس (Titus) نے ۷۰ء میں یروشلم پر حملہ کر کے یہود کا قتل عام کیا اور ہیکل کو بالکل تباہ و برباد کر دیا، زندہ بچ جانے والے یہودیوں کو جلاوطن کر دیا گیا اور یروشلم میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا، تاہم بعد کے ادوار میں یہ پابندی نرم کر کے یہودیوں کو مخصوص مواقع پر یروشلم میں آنے اور ہیکل کے کھنڈرات کی زیارت کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ [م-ع-ا]

[3] ۱۳۶ء میں رومی شہنشاہ ہیڈرین نے یروشلم کو دوبارہ آباد کر کے اس کا نام ایلیاہ (Aelia Capitolina) رکھا اور ہیکل کی جگہ یونانی دیوتا Jupiter کے نام پر ایک عالی شان معبد تعمیر کرا دیا۔ چوتھی صدی عیسوی میں مسیحیت کے روم کا سرکاری مذہب بن جانے کے بعد ۳۳۶ء میں قسطنطین اعظم نے اس معبد کی جگہ کلیسائے نشور (Church of Resurrection) تعمیر کرا دیا۔ [م-ع-ا]

اسی نام سے موسوم تھا، تاایں کہ آنے والا آیا اور جس طرح اس نے دنیا کے پاکوں کی تقدیس کی، یہودیوں کے اس پاک شہر کا نام بھی بیت المقدس ہو گیا۔

ہوتا رہا، تباہیوں کا اور بربادیوں کا یہ سلسلہ یونہی جاری رہا، سمجھا جاسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تک پہنچنے کا یہ تنگ و تاریک سوراخ حوادث وواقعات کے طوفانوں میں کہاں تک کھلا رہ سکتا ہے اور اس پر یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ بچھڑنے کے بعد بھی وہ اپنے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام سے نہیں بچھڑے، دنیا فیصلہ کرسکتی ہے کہ یہودی جس آئینہ کو پیش کررہے ہیں کیا اس میں واقعی حضرت موسیٰ اوران کی پاک تعلیم کی وہ صورت نظر آسکتی ہے جو واقعی ان کی صورت تھی؟ راکھ کے اس ڈھیر سے ''موسوی شریعت'' کا جو سانچہ تیار کیا گیا ہے، کیا سچ مچ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کا سچا قالب (سانچا) ہوسکتا ہے؟ سچائی کی پیاس ہی جن میں بجھ کررہ گئی ہو، جن کو بجائے یقین کے شک ہی کے انگاروں پر لوٹنے میں ٹھنڈک میسر آتی ہو ان سے بحث نہیں ہے، لیکن وہ جن میں صداقت کی تڑپ ہے، جو واقعی ایمانی بشاشت (خوشی) کی تلاش میں ہیں کیا شبہات وشکوک کے ان گھپ اندھیروں میں وساوس واوہام کے ایسے خطرناک گھنے جنگلوں میں اس لئے گھس سکتے ہیں کہ ان کو وہاں اَبدی زندگی کا چشمہ نصیب ہوگا۔

کیسی عجیب بات ہے کہ تقریباً دو ہزار سال سے جس خاکستری توراۃ کے بھی صرف ترجموں، غلط سلط ترجموں در ترجموں کا دنیا میں رواج ہو، جس میں ایسے واقعات اور اسماء بکثرت پائے جاتے ہوں، جو قطعی طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کے ہیں، اُف! جس میں خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات، ان کی تجہیز وتکفین تک کی داستان درج ہو (استثناء باب ۳۴) کسی میں جھوٹ کو برداشت کرنے کی اتنی صلاحیت ہے کہ اس کو پھر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل شدہ کتاب قرار دے، ممکن ہے کہ مذہب میں منطق کو دخل نہ ہو، لیکن کیا اس حد تک کہ علانیہ جن کتابوں میں پیغمبروں پر شراب خوری یا حرام کاری کا الزام لگایا گیا ہو، لوط جیسے الوالعزم نبی اللہ کو (العیاذ باللہ) اپنی بیٹیوں سے ملوث کیا گیا ہو، خداوند قدوس کے کلام

کو ایسی فحش گالیوں سے بھرا گیا ہو، جن کو بازار کے غنڈے بھی اپنی زبانوں پر لاتے شرماتے ہوں، جس کتاب کا خدا پچھتاتا ہو، روتا ہو، کیا یہ اس رب قدوس کی کتاب ہوسکتی ہے جس کی تقدیس وتحمید (پاکیزگی اور تعریف) کا ترانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد کے رسولوں نے دنیا کو سنایا تھا؟

اس رومن کیتھولک[1] پادری کے قلم سے گو مناظرہ کے جھوک (تکرار) ہی میں سہی لیکن ایک پروٹسٹنٹ عیسائی[2] کو مخاطب کرتے ہوئے کتنے صحیح الفاظ نکل آئے ہیں:

---

[1] ''کیتھولک'' دینی معاملات میں اپنے اوپر کیتھولک کلیسا اور اس کے سربراہ پاپائے روم کی حکمرانی قبول کرنے والے عیسائیوں کو کیتھولک عیسائی کہا جاتا ہے، پروٹسٹنٹ کے برخلاف یہ پاپائے روم بشمول بشپ کو اپنا حتمی دینی فیصل مانتے ہیں، ان کی عبادت میں پیران کلیسا کا بندوں اور خدا کے مابین ایک ناگزیر واسطہ کی صورت میں براجمان رہنا طے ہے، عبادت قبول کروانا، گناہ بخشوانا، اعتراف سیئات کرنا، جہنم سے خلاصی کروانا اور جنت کا حصول، غرض کلیسا کی ہر جگہ ضرورت ہے۔ حلال اور حرام بھی خاصی بڑی حد تک کلیسا کا ہی اختصاص ہے، کیتھولک کلیسا اپنی بنیاد اصل مسیحی برادری کو مانتی ہے جو کہ یسوع مسیح نے خود قائم کی تھی اور جس کی کفالت بارہ رُسُل خصوصاً پطرس نے کی تھی، اس کی بنیاد رکھنے والا حواریین میں سے پطرس تھا، یہ بشپ اور پاپائے اعظم کو پطرس کا جانشیں تصور کرتی ہے، یہ حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کی تصویروں یا بتوں کی پرستش کو جائز سمجھتے ہیں۔ [م-ع-ا]

[2] ''پروٹسٹنٹ'' عیسائیوں کا وہ فرقہ جو سولھویں صدی میں اصلاح کلیسا کے زمانے میں کلیسائے روم سے علیحدہ ہوا، یہ لوگ مارٹن لوتھر کے پیروکار ہیں جو سولھویں صدی عیسوی کے شروع میں ظاہر ہوا، اس نے رومن کیتھولک کلیسا کے تمام پاپاؤں کی مخالفت شروع کردی اور پروٹسٹنٹ مذہب کی بنیاد رکھ دی، لوتھر نے جب پاپائے روم اور کلیساؤں کی بدعنوانیاں دیکھیں تو نوے سے زائد اعتراض کر ڈالے، مقامی کلیسا نے لوتھر کو حکم دیا کہ وہ توبہ کرے اور اپنے اعتراضات واپس لے، لوتھر نے انکار کر دیا، چنانچہ قلمرو ئے جرمنی میں اس کا بائیکاٹ کر دیا گیا، لیکن اس کے خیالات تیزی سے پھیلتے چلے گئے یہاں تک کہ سارا جرمنی اصلاح کلیسا کی آوازوں سے گونج اٹھا، لوتھر نے خود عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید کے ترجمے کیے، اس فرقے کی اہم بات جس کی بنا پر یہ دیگر فرقوں سے ممتاز ہوتے ہیں یہ ہے کہ انہوں نے انجیل کو ہی عیسائیت کا بنیادی مصدر ومنبع مانا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اہل کلیسا کو گناہوں کی بخشش کا کوئی حق حاصل نہیں اور نہ ہی وہ راہب بننے کی ضرورت کے قائل ہیں، اسی طرح انہوں نے دین داروں کے لیے نکاح جائز قرار دیا ہے اور نیز گرجوں میں سجدہ کرنے کے لیے تصویریں اور مورتیاں رکھنے کے بھی قائل نہیں کہ یہ بت پرستی کا عمل ہے۔ [م-ع-ا]

''اب میں کسی پروٹسٹنٹ سے پوچھتا ہوں کہ بھلا وہ اپنی نجات کی دل جمعی صرف ایک ایسی کتاب کے بھروسہ پر رکھ سکتا ہے جسے وہ کلام الٰہی نہیں ثابت کرسکتا، ایک کتاب جسے وہ سمجھ نہیں سکتا، ایک کتاب جسے جہلاء وضعفاء اپنی ہلاکت کے لئے پڑھتے ہیں، ایک کتاب جس کے اکثر حصے کھوئے گئے ہیں، ایک کتاب جو از بس غلطیوں سے بھری گئی اور ناقص کی گئی ہے، جس میں نجات پانے کی سب ضروری چیزیں نہیں ہیں، ایسی کتاب کیا ایمان کا قاعدہ کلی اور نجات کی مکمل راہ ہوسکتی ہے؟۔'' [1]

جو اپنی ''دینی شریعت'' کا سرچشمہ اس کتاب کو قرار دیتے ہیں، جب ان کی یہ شہادت ہے تو کیوں نہ یقین کیا جائے کہ خدا کے یہاں سے جو کتاب جانے ہی کے لئے آئی تھی اس کے جانے کا وقت آگیا تھا، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ بخت (نصیب) واتفاق یا بے نظمی کے تحت نہیں بلکہ تقدیری نظام کی ماتحتی میں وہ آئی بھی اور اسی قانون کے زیر اثر وہ جہاں سے آئی تھی چلی گئی، اور جس طرح اسرائیل کے دس اسباط کو بچھڑنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی تعلیم سے ملنا نصیب نہ ہوا، تقریباً کچھ اسی طرح وہ دو اسباط بھی کھوئے گئے، اگرچہ اب تک اسی غلط فہمی میں ہیں کہ ہم پائے ہوئے ہیں۔

باقی رہی دنیا کی وہ مذہبی جماعت جس کے پیغمبر نے اگرچہ کل اپنی ڈھائی سال کی نبوت کے بعد ان سے کھلے لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ:

''میرا جانا ہی تمہارے لئے بہتر ہے کہ آنے والا میرے جانے کے بغیر نہیں آئے گا''۔

---

[1] ماہنامہ ترجمان القرآن مضمون ذوقی شاہ صاحب بحوالہ کتاب مراۃ الصدق مصنفہ پادری بیڈلی مترجم مسٹر نکلسن ص ۱۶۱۔

اور یہ کہہ کر وہ جو جانے ہی کے لئے آیا تھا چلا گیا، پر عیسائی کہتے ہیں کہ نہیں گیا، مگر جب پوچھا جاتا ہے کہ تم مسیح علیہ السلام اور ان کی زندگی کو کن راہوں سے پاتے ہو تو دیکھنے کا وہ وقت ہوتا ہے، جب یہ ایک دوسرے کو تاکتے ہیں، گھورتے ہیں، کیا مسیح کی کوئی کتاب تمہارے پاس ہے؟ کیا اس کی کتاب کا کوئی ترجمہ تمہارے پاس ہے؟ حیرت کی خاموشی کے سوا ان مسکینوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے، نامعلوم الاسم والحال (گمنام) شخصیتوں کے ہاتھوں کے کچھ میلادی مسودے [1] ہیں، جن کی وقعت (اہمیت) مسلمانوں کے ان عام میلادی رسالوں سے زیادہ نہیں، جنہیں ''سعیدی'' یا ''شہیدی'' وغیرہ ناموں سے دو دو تین تین آنے پیسے لے کر گشتی (پھرنے والا) مولود خواں (پڑھنے والا) ہندوستان میں پڑھتے پھرتے ہیں، ان ہی رسالوں کا نام انجیل رکھا گیا ہے! اسی قسم کی ہزار ہا انجیلوں میں سے انتخاب کر کے ڈھنڈورا پیٹ دیا گیا کہ خدا کی کتاب مل گئی، مسیح اور ان کی تعلیم مل گئی، نجات کی روشنی مل گئی۔

اور ان کتابوں کا انتخاب کس طرح ہوا، ہر عیسائی جانتا ہے کہ نیقیہ کونسل [2] والوں نے گرجا کے صدر مقام پر انجیلوں کے اس انبار کو تہ برتہ کر کے رکھ دیا، کہا جاتا ہے کہ اس کے نیچے جبوں والے پادری سجدے میں گر کر آنکھیں بند کر کے یہ دعا کرتے رہے، دل ہی دل

---

[1] میلادی مسودے: وہ تحریرات اور مضامین جن میں ولادت وغیرہ کے بارے میں خوشی کا اظہار کیا گیا ہو (Birthday essay)، واضح رہے کہ عیسائیوں کا مشہور تہوار کرسمس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی خوشی میں منایا جاتا ہے، عیسائیوں کے ہاں یہ دن عید کی حیثیت رکھتا ہے اور کرسمس ڈے کو ''عید میلاد مسیح'' بھی کہتے ہیں، سالگرہ منانے کی رسم بھی اسی تصور ہی کی ایک کڑی ہے۔ [م-ع-ا]

[2] مشرقی روم کا ایک شہر تھا جس کو انگریزی میں فیلس کہتے ہیں ۳۲۵ء میں قسطنطین اعظم کے ایما سے اس شہر میں علماء نصاریٰ کی ایک مشہور کونسل ہوئی جس میں تین سو سے زیادہ بشپ اور پیٹرس شام و عراق سے لے کر جزائر برطانیہ تک کے شریک تھے، دو مہینے تک اس کے اجلاس بادشاہ کی صدارت میں ہوتے رہے اور اسی کونسل نے ''تین ایک ہے، ایک تین ہے'' کے معمہ کو مسیحی مذہب کا جزو اعظم بلکہ بنیاد ٹھہرایا۔

میں یہ منتر پڑھتے جاتے تھے:

''جو جھوٹی ہے سو گر جائے، جو جھوٹی ہے سو گر جائے''

کہتے ہیں کہ سب گر گئیں، صرف چار اوران کے ساتھ پولوس کے کچھ خطوط بھی گرنے سے رہ گئے، سجدے سے سر اٹھا کر وہی سر پر رکھی گئیں، اس کے بعد ''مسیح علیہ السلام کی سچی انجیل یہی ہے''، اس آواز سے آسمان کو سر پر اٹھالیا گیا، کہا جاتا ہے کہ کونسل کے ان پادریوں میں سے دو کا انتقال بھی ہو گیا تھا۔

ان کی قبروں پر اس رپورٹ کی مسل (روئیداد) رات کو رکھ دی گئی، صبح کو توثیقی دستخط اس پر ثبت شدہ تھے، تصحیح وتغلیط، تنقید وتنقیح کے اس عجیب وغریب انوکھے طریقہ پر شاید دنیا نے نہ اس سے پہلے کبھی عمل کیا تھا، نہ ان کے بعد کسی کو اس کی نوبت آئی۔

اسی فیصلہ سے یقین پیدا ہوا، اور اسی یقین پر عیسائی جی رہے ہیں!

﴿أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ﴾ افسوس ہے تم پر اور جن کو تم پوجتے ہو۔

حالانکہ جیسا کہ مسیح علیہ السلام نے فرمادیا تھا کہ: ''میرا جانا ہی تمہارے لئے مفید ہے''، اس پر عیسائی کان دھرتے اور جو جا چکا تھا اس کے ٹھہرے رہنے پر اصرار نہ کرتے تو مسیح کے جانے کے بعد جو جانے کے لئے نہیں، بلکہ آنے ہی کے لئے آیا اس کے پہچاننے میں انہیں کتنی آسانی ہوتی، نہ میز سے انجیل گرانے کا منتر پڑھنا پڑتا، نہ مُردوں سے دستخط لینے کی ضرورت پیش آتی۔

اور کیا صرف مسیح علیہ السلام نے آنے والے کے آنے کا دنیا کو منتظر بنایا تھا جو مسیح علیہ السلام کے جانے کے ساتھ ہی آ گیا، اس پر کیا تعجب ہے کہ انہوں نے اتنا قریب سے اس کو دیکھ لیا اور سچ تو یہ ہے کہ ڈھائی سال کی اس نبوت کا مقصد اگر بجائے تعمیر کے عیسائی بھی اسی طرح

آنے والے کی تبشیر اور: ﴿مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾[1] قرار دیئے
جیسا کہ قرآن نے قرار دیا ہے تو حضرت مسیح علیہ السلام کی جگہ وہ اسی کو ڈھونڈتے، جس کے بتانے
کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تھے۔

بہر حال مسیح علیہ السلام نے اگر یہ کہا تو یہی کہنے کے لئے وہ آئے تھے[2] مگر جس
طرح مغربی زمینوں کو درست کرنے والے نے اپنا فرض اس طرح ادا کیا، دیکھو کہ اس سے
پانچ سو برس پہلے مشرقی ممالک کو ایک مشرق بنانے والے نے بھی، جس نے دھرم کا نرسنگھا
[3] (باجا) ایران سے چین کی دیواروں تک پھونکا، سنو! چلتے ہوئے اس نے دنیا کو کیا
وصیت کی؟ اگرچہ بہت کچھ مٹ چکا ہے لیکن مٹنے سے جو چیزیں بچ گئی ہیں اس میں مہاتما
بدھ کا یہ آخری فقرہ اب تک زندہ ہے جس کو اپنی زندگی ختم کرتے ہوئے خدا کے اس بندے
نے اپنے شاگرد نندا کے کان میں اس وقت ڈالا، جب اس کی سانس اکھڑ رہی تھی اور اس کا

---

[1] مژدہ سناتے ہوئے اس بات کا (مسیح نے) کہ میرے بعد ایک رسول آ رہا ہے جس کا نام "احمد" ہے، قرآن کی اس مشہور آیت کا ترجمہ ہے جو سورہ صف کے پہلے رکوع کی آیت ہے، یہی لفظ ہے جس کا ترجمہ یونانی زبان میں "فارقلیط"، "پرکلوطوس" سے کیا گیا ہے، اور اب جس کے ترجمہ میں ہر سال اصلاح کی جاتی ہے "روح القدس، تسلی دہندہ، شفیع، وکیل، روح حق" اور خدا جانے کیا کیا، لیکن محققین علماء نصاریٰ میں ایسے لوگ بھی گذرے ہیں، جنہوں نے اس کا ترجمہ "احمد" ہی صحیح قرار دیا ہے، دیکھو خطبات احمدیہ سرسید احمد خاں۔

[2] واقعہ یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام سے ساڑھے چار سو برس پیشتر ہندوستان میں بدھ مت کے نام سے ایک تحریک اٹھی جس نے بتدریج متعدد و متفرق، مشرق (جاپان، چین، ہندوستان، ترکستان، تاتار، منگولیہ وغیرہ) کو ایک مذہبی رشتہ میں جوڑ کر ایک مشرق بنا دیا، اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کی بدولت متعدد مغرب ایک مغرب بن گیا، جب یہ ہو چکا تب وہ آیا جس نے مشرق و مغرب کے قصہ کو ختم کر کے دنیا کو، ایک مذہب، ایک کتاب، ایک قبلہ والی دنیا بنا دیا، اسی لئے میں بدھا کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشرقی نقیب اور مسیح علیہ السلام کو مغربی نقیب خیال کرتا ہوں۔

[3] "نرسنگھا" ایک قسم کا باجا بجانے کا سینگ نما بگل، جسے بگل کی پھونک سے بجاتے ہیں، قدیم ایام میں شاہی جلوس یا اعلان جنگ وغیرہ کے موقع پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا۔ [م-ع-ا]

یہ مخلص خادم اس کے قدموں کو اپنے آنسوؤں سے یہ کہتے ہوئے دھو رہا تھا:

''آقا! آپ کے جانے کے بعد دنیا کو کون تعلیم دے گا''؟

بدھ نے اس کے جواب میں کہا:

''نندا! میں پہلا بدھ نہیں ہوں جو زمین پر آیا نہ میں آخری بدھ ہوں، اپنے وقت پر دنیا میں ایک اور بدھ آئے گا''۔

''مقدس، منور القلب (روشن دل والا)، عمل میں دانائی سے لبریز (بھرا ہوا)، مبارک، عالم کائنات، انسانوں کا عدیم النظیر (جس کی مثال نہ ہو) سردار، جو غیر فانی (ختم نہ ہونے والے) حقائق میں ظاہر کرتا رہا ہوں، وہ بھی وہی ظاہر کرے گا، وہ ایک مکمل اور خالص مذہبی نظام زندگی کی میری طرح تبلیغ کرے گا''۔

نندا نے کہا: ''ہم اس کو کس طرح پہچانیں گے''؟

آقا نے فرمایا: ''وہ میتریا کے نام سے موسوم ہوگا''۔

۱۶، اکتوبر ۱۹۳۰ء کی اشاعت میں الہ آباد کے مشہور ہندو انگریزی اخبار ''لیڈر'' میں ایک بدھشٹ کا یہ مضمون صفحہ سات کالم تین میں شائع ہوا تھا، جس میں اسی ''میتریا'' لفظ کا ترجمہ نامہ نگار مذکور نے لکھا تھا: ''وہ جس کا نام رحمت ہے''۔

کیا اس کے بعد اس میں شک کرنے کی گنجائش ہے کہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا مغربی مقدمۃ الجیش[1] اور مبشر جاتے ہوئے اپنے جس فرض سے سبکدوش ہوا تھا، بجنسہ اسی فرض کو اس نے بھی خوبی کے ساتھ ادا کیا، جس کو خواہ دنیا کچھ خیال کرتی ہو لیکن واقعات بیان کرتے ہیں کہ وہ بھی جہاں کے ابرِ رحمت کے لئے مشرق کی کھیتیوں کا تیار کرنے والا تھا

[1] مقدمۃ الجیش: وہ لشکر جو آگے بھیج دیا جائے، ہراول دستہ فوج۔ [م-ع-ا]

اور بلاشبہ چین، ایران، بخارا، خراسان، ترک، تاتار، منگولیہ، افغانستان، سرحد، بلوچستان سندھ وہندوستان کے بدھوں نے رحمت کی اس بارش سے جتنا فائدہ اٹھایا، دنیا کی کسی قوم نے نہیں اٹھایا[1]، کاش ایسا ہوتا کہ مغربی نقیب[2] کے ماننے والے بھی بجائے تین کو ایک، ایک کو تین ثابت کرنے کے لایعنی جھگڑوں کے بجائے اپنے ہادی کی اس آرزو کو پورا کرتے، جس کا پورا کرنا اس کے وجود کا سب بڑا مقصد تھا (صلوٰۃ اللہ علیہم والسلام) اور قریب ہے کہ اپنی اس آرزو کو وہ ان سے پوری کرائے، اور کیا مشرق ومغرب کے ان دونوں نقیبوں ہی نے دنیا میں اس آنے والے کی آمد کا گھنٹہ بجایا؟

جو ''عہد کا رسول'' اور ''میثاق کا نبی'' تھا[3] اس کے متعلق عہد کرنے والوں میں سے کس نے عہد شکنی کی، یہ دونوں تو اس سے بہت زیادہ دور نہ تھے لیکن جو اس سے دور اور بہت دور تھے، انہوں نے بھی دنیا کے آگے کیا اس سے اپنا قرب نہیں جتلایا، سینا کی روشنی میں حضرت کلیم کو دکھایا گیا، دیکھ کر وہ چلائے:

''خدا سینا سے نکلا، سعیر سے چمکا اور فاران ہی کے پہاڑوں سے جلوہ گر ہوا[4] دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ''۔ (پیدائش باب ۱۷-۲)

دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو بھی دیکھ رہے ہیں اور اس کے صدقہ میں

---

[1] مناسب تھا کہ اس عنوان پر موجودہ بودھست تاریخ سے انتخاب کر کے کوئی صاحب مستقل کتاب تصنیف کرتے اس کی شدید ضرورت ہے۔

[2] نقیب: بشیر کرنے والا، خبر دینے والا، مدح خواں۔ [م-ع-ا]

[3] قرآن کے سوا ''ملاکی'' نبی کی کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ لقب بجنسہ موجود ہے۔

[4] فاران بکہ کی پہاڑیوں کا نام ہے، بائبل کے لٹریچر کے لحاظ سے یہ ایک بدیہی حقیقت ہے، تاہم حق پوشی کے لئے بجائے عرب کے اس کو دنیا کے دوسرے خطوں میں تلاش کرتے ہیں۔ خطبات احمدیہ میں سرسید مرحوم نے اس پر مفصل بحث کی ہے۔

ہزار ہا برس پہلے ان کو بھی دیکھ رہے تھے، جنہوں نے صرف اس کو دیکھ کر ملائکہ کا رتبہ حاصل کیا، ایک دو کو نہیں دیکھا بلکہ ان کی دس ہزار کی تعداد کو دیکھا، ان کی قدوست کی شہادت ادا کی۔ [1]

داؤد علیہ السلام اس کے گھر کی تمنا میں بے چین ہو ہو کر اپنی بانسری سے یہ پُرسوز لے پیدا فرماتے تھے:

"مبارک ہیں وہ تیرے گھر میں بستے ہیں، وہ سدا تیری حمد کرتے ہیں، وہ مکہ سے گزرتے ہوئے، ایک کنواں بناتے ہوئے۔" (زبور باب ۱۸)

قرآن نے اگر مکہ ہی کا نام بکہ بتایا تو تم کو اطمینان نہیں ہوا، لیکن جب قرآن کے مشہور دشمن مارگولیوتھ [2] نے بھی گواہی دی کہ زبور کا یہ بکہ عرب کے مکہ کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تو منکر اب کیوں چپ ہیں، [3] حالانکہ جس کے باپ نے بیابان میں اپنی بانسری بجائی تھی اسی کے بیٹے سلیمان علیہ السلام نے اپنے شاہی تخت پر اس کے آگے سر بھی جھکایا تھا، اشاروں کنایوں میں نہیں علانیہ نام لے کر اپنے دل کی اس لگن کا اظہار ان لفظوں میں فرمایا:

"خلو محمدیم زہ دودی زہ رعی"۔ (تسبیحات سلیمان پ ۵۔ ۱۲)

"وہ ٹھیک محمد (ﷺ) ہیں، وہ میرے محبوب ہیں، میری جان!"

اور کیا اس کے لئے، اس کے گھر کے لئے، صرف حضرت داؤد و سلیمان علیہما

---

[1] بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ فتح کر کے جب مکہ میں داخل ہوئے تو آپ کے ساتھ اس وقت دس ہزار صحابہ کرام تھے۔

[2] ڈیوڈ سموئیل مارگولیوتھ مشہور مستشرقین میں سے ہیں، ۱۸۵۸ء میں برطانیہ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۰ میں وفات پائی، ۱۸۸۹ء سے ۱۹۳۷ء تک آکسفورڈ یونی ورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے۔ [م-ع-ا]

[3] دیکھو سیرت النبی شبلی مرحوم بحوالہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا لفظ "محمد (ﷺ)"۔

السلام ہی تڑپے!

"بیابان (عرب) اور اس کی بستیاں قیدار (بن اسماعیل) کے آباد گاؤں اپنی آواز بلند کریں گے، سلع کے باشندے ایک گیت گائیں گے، پہاڑوں کی چوٹیوں سے للکاریں گے، وہ خداوند کا جلال ظاہر کریں گے۔" (یسعیاہ نبی کی کتاب باب ۴۲)

سچ کو جھوٹ بنانے کے لئے تم پہاڑوں کو مٹا نہیں سکتے، مدینہ منورہ کے ہر بچے سے اب بھی پوچھ سکتے ہو کہ وہ اپنی بکریوں کے لئے گھانس کس پہاڑ کے دامن سے لاتے تھے۔[1] جب آنے والا مکہ سے مدینہ آ رہا تھا اور جس کو حبقوق نبی نے دیکھ کر صدیوں پہلے اسی طرح خوشی کا نعرہ مارا:

"اللہ جنوب سے، اور وہ جو قدوس ہے، کوہ فاران سے آیا اور اس کی شوکت سے آسمان چھپ گیا، زمین احمد کی حمد سے بھر گئی۔"

(کتاب نبی مذکور باب ۳)

اور یسعیاہ نبی اپنے جوش بیان میں اس کا غلغلہ اس طرح بلند کر رہے تھے:

"عرب کے صحرا میں رات کاٹو گے، اے ودانیوں کے قافلو!
پانی لے کر پیاسے کا استقبال کرنے آؤ، اے تیماء کی سرزمین کے باشندو!
روٹی لے کر بھاگنے والوں کو ملنے آؤ، کیونکہ وہ تلواروں کے سامنے سے، ننگی تلواروں، کھچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدت سے بھاگے ہیں۔"

(یسعیاہ باب ۲۱)

کیا آنے والے کی اس آمد پر دامن سلع کے باشندے، مدینہ والے:

---

[1] سلع ہی کے پاس اب تک خندق کے نشانات موجود ہیں اور یہ پہاڑ اسی نام سے اب تک مشہور ہے۔

"طلع البدر علینا"

اور اسی قسم کے جن گیتوں سے پہاڑوں کی چوٹیوں پر للکار رہے تھے دنیا کی کس قوم کے حافظہ میں اب وہ گیت محفوظ نہیں ہیں، دیکھو! اسی للکار سے قیدار کی اولاد (قریش مکہ) کی عظمت بدر کے کنوئیں میں غرق ہوئی، کیا ٹھیک تاریخ کی قید کے ساتھ وقوع سے پہلے اور سینکڑوں سال پہلے ہی یسعیاہ پیغمبر یہ کہتے ہوئے چلا نہیں رہے تھے:

"ٹھیک ایک سال مزدوروں کے ایک سال میں قیدار کی ساری حشمت خاک میں مل جائے گی۔"

اور میں کیا بتاؤں کہ ان پیمانِ وفا باندھنے والوں نے کتنی قوت کے ساتھ اپنے اپنے وعدوں کا ایفاء (پورا) کیا ہے، حالانکہ ان کا سب کچھ مٹا دیا گیا ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ کس کی قوت نے ان خاص نوشتوں (تحریروں) کو مٹنے سے بچالیا، ملاکی نبی نے سچ فرمایا تھا:

"وہ خداوند جس کی تلاش میں تم ہو، ہاں! عہد کا رسول [1] (صلی اللہ علیہ وسلم) جس سے تم خوش ہو، وہ اپنی ہیکل میں ناگہاں آئے گا، دیکھو! وہ یقیناً آئے گا، رب الافواج فرماتا ہے! پر اس کے آنے کے دن میں کون ٹھہر سکے گا، اور جب وہ نمودار ہوگا کون کھڑا رہے گا۔" (ملاکی نبی کی کتاب باب ۳)

جس ہیکل میں وہ ناگہاں آیا [2]، سب جانتے ہیں کہ کسی زمانہ میں اس کے

---

[1] قرآن کی آیت: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ﴾ الخ میں صاف اعلان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تمام پیغمبروں سے عہد لیا گیا اور اس عہد کا گواہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے آپ کو بنالیا۔

[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر اس طرح اچانک مکہ پہنچے ہیں کہ صحابہ کی دس ہزار فوج جب مکہ کے سواء میں پہنچی اور رات کو کھانا پکانے کے لئے چولہے روشن کئے گئے تب ابوسفیان اور مکہ والوں کو علم ہوا کہ آپ آگئے۔

مٹانے پر ایکا (اتحاد) کر کے جو عہد نامہ کعبہ میں لٹکایا گیا تھا، اس میں بھی یہی پیش آیا تھا[1] جو ان عہد کرنے والوں کی کتابوں کے ساتھ پیش آیا، اور کون ہے جو اس کے آگے کھڑا رہتا:

"وہ سنار کی آگ اور دھوبی کے صابون کی طرح ہے۔" (ملا کی نبی باب ۳)

جو جلنے کے لئے تھا، وہ جل گیا، اور جو ڈھلنے کے لئے تھا، وہ ڈھل گیا اور جو چمکنے اور صاف ہونے کے لئے تھا وہ چمکا اور ستھرا ہوا، اور باوجود چھپانے کے اب تک چمک رہا ہے، خیر! بات بہت دور جائے گی اگر اس ضمنی بحث کی تفصیل میں اور آگے بڑھا گیا، میرے سامنے تو اس وقت صرف یہ تھا کہ جتنے آنے والے آئے، سب جانے کے لئے آئے اور بینات (روشن دلائل)، واضح شہادات کی روشنی میں دیکھا جا چکا ہے کہ جو بھی آیا، بالآخر ایک ایک کر کے کسی نہ کسی طرح خود وہ، ان کی زندگی، ان کی تعلیم، جہاں سے طلوع ہوئی تھی وہیں بالآخر غروب ہوگئی اور بلاشبہ ان کے لئے یہی مقدر تھا، قدرت کے باندھے قانونوں کو دنیا کا کون ساز ور کھول سکتا ہے؟ پر اب دیکھو کہ وہ آتا ہے، جو آنے ہی کے لئے آیا، کس شان کے ساتھ آیا، کس آن کے ساتھ آیا، مصریوں کی غلامی میں صدیاں بسر کرنے والوں میں نہیں، بلکہ جب سے دنیا ہے، آدم کے جن گھرانوں کو محکومیت (غلامی) کی لعنت نے کبھی نہیں چھوا، جن کے دماغ میں آزادی کی ہوا کے سوا کبھی کسی قسم کی غلامی کی گندگی نہیں پہنچی اور جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام سے کہا گیا تھا کہ:

"وہ عربی ہوگا، اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کا ہاتھ اس کے خلاف ہوگا۔" (پیدائش باب ۱۶۔ ۱۲)

اور اسی لئے وہ اپنی آزادی کو ہر چیز سے مہنگی خیال کرتے ہوئے:

---

[1] قریش نے ایکا کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کھانا پانی بند کیا تھا، اس پر جو باہمی معاہدہ ہوا تھا کعبہ میں لٹکایا گیا لیکن دیمک تمام ظالمانہ باتوں کو چاٹ گئی۔

"وہ اپنے سب بھائیوں کے درمیان بود و باش کرے گا۔" (باب مذکور)

بلاشبہ آدم کی ساری اولاد کے درمیان شاید یہی ایک نسل تھی جس نے اپنے ہاتھ کو سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ کو اپنے خلاف رکھ کر ہمیشہ ایسی زندگی بسر کی جو دنیا کے کسی خطہ کے باشندوں کو میسر نہ ہوئی ہو، وہ ان ہی آزادوں میں اٹھا اور محسوس قوتوں میں جن چیزوں کا نام قوت رکھا گیا ہے، ایک ایک کے پنجے سے انسانیت کو آزادی دلانے کے دعوے کے ساتھ اٹھا۔

دنیا والے، ساری دنیا والے بلکہ حد تو یہ تھی کہ اس آزاد دنیا والے بھی، انسانوں کے آگے تو نہیں لیکن سچی قوت سے ٹوٹ کر جھوٹی اور وہمی قوتوں کے وہمی بوجھ کے نیچے شاید تین ساڑھے تین سو سال سے دبے ہوئے تھے اور کتنے ہیں جو اب تک دبے ہوئے ہیں، وہ ان تمام کاذب (جھوٹی) قوتوں کو جھٹلاتا ہوا اُٹھا۔ [1]

والدین کی وفات

پھر دیکھو! جس کا باپ مرجاتا ہے تو جھوٹی قوتوں کے ماننے والے گھبرا گھبرا کر چلاتے ہیں، واویلا مچاتے ہیں کہ اس بچے کو کون پالے گا؟ بے زوری کو زور کہنے والوں کا زور توڑنے کے لئے خود اس کے ساتھ یہ دکھایا گیا کہ پیدا ہونے کے بعد نہیں بلکہ اس سے پہلے کہ وہ آئے، اس میدان میں آئے، جہاں جھوٹی قوتوں سے آزادی کا پرچم کھولا جائے گا، وہ دھوکے کی اس قوت سے آزاد ہو گیا، جس کا نام دنیا نے باپ رکھا ہے اور ٹھیک جس طرح ظہور سے پہلے اس کی ہستی نے اس آزادی کی شہادت ادا کی، نمود (عمر کے بڑھنے)

---

[1] سرزمین عرب جس کے مختلف حصوں میں حضرت اسمٰعیل کی اولاد اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کی نسل پھیلی ہوئی تھی، اندازہ کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ولادت سے کل تین ساڑھے تین سو سال پہلے سے بت پرستی میں اس ملک کے لوگ مبتلا ہو گئے تھے ورنہ اس سے پیشتر عموماً ابراہیمی دین عربی قبائل میں پھیلا ہوا تھا دیکھو "الفوز الکبیر" شاہ ولی اللہ دہلوی۔

کے ساتھ ہی چند ہی دنوں کے بعد اس غلط بھروسے کا تکیہ بھی اس کے سر کے نیچے سے کھینچ لیا گیا، جس کو ہم سب ماں کہتے ہیں۔

عبدالمطلب کی کفالت اور ان کی وفات

جو اپنی جوانی کی قوتوں کو کھو کر بڑھاپے کی ہلی ہوئی دیوار کے سہارے زندگی کی نمائش ختم کر رہا تھا، اس پیرانہ سری (بڑھاپے) کے ساتھ آپ کے جدامجد (دادا) نے چاہا تھا کہ یتیمی آزادی کی واشگاف (ظاہر) ہونے والی حقیقت میں کچھ اپنی شرکت سے اشتباہ (دھوکا) ڈال دیں، لیکن جو اپنے دعویٰ کی خود دلیل تھا اس کی دلیل کمزور ہو جاتی، اگر عین وقت پر عبدالمطلب کی سرپرستی کے فریب کا پردہ چاک نہ کر دیا جاتا، آخر وہ بھی چاک کر دیا گیا۔

ابوطالب کی کفالت

حقیقت جتنے بین (واضح) اور شاندار چہرے کے ساتھ اب اس بے مادر و پدر (بغیر ماں باپ) اور لاوارث یتیم کی پیشانی سے چمک رہی تھی، وہ نہ چمکتی، اگر کہیں بجائے بے مایہ (محتاج) و بے بضاعت (غریب) عم (چچا) محترم حضرت ابو طالب کے، خدا نخواستہ آپ کی نگرانی مکہ کے ساہوکار (سودی لین دین کرنے والے) عبدالعزیٰ مشہور بہ ابی لہب کے سپرد ہوتی، لیکن شیر کے بچے لومڑی کے بھٹوں (گھروں) میں نہیں پالے جاتے، جس قطرہ کی قسمت میں موتی ہونا ہے، وہ گھونگوں [1] (سمندری کیڑا) اور مینڈکوں کے منہ میں نہیں گرتا۔

غریب ابوطالب کی کفالت سے اس کے برہانی (قطعی و یقینی) وجود میں کیا

---

[1] دریائی یا سمندری کیڑے کا خول جو ہڈی کی مانند اور گنبد نما پیچ دار ایک جانب سے کھلا اور دوسری جانب سے بند ہوتا ہے، سیپی، سنکھ (Cochlear Helix) [م-ع-ا]

ضعف پیدا ہوتا، جس کے متعلق شاید بہتوں کو علم نہیں ہے کہ مدتوں ان کی یعنی ابو طالب کی گزران (بسر اوقات) ان قراریط[1] ہی پر تھی جو بکریوں اور اونٹوں کے چرانے کے صلہ میں ان کا یتیم بھتیجا مکہ والوں سے مزدوری میں پاتا تھا، کیسی عجیب بات ہے جو اپنے حقیقی بچوں کی پرورش کا بوجھ بھی اپنے سر پر نہیں اٹھا سکتے تھے اور اسی لئے مجبوراً جعفر، عباس کی، اور علی اس کی گود میں ڈال دیئے گئے[2]، جن کی گود میں وہ پلنے کے لئے پیدا ہوئے تھے، تو پھر یہ کیسا بے بنیاد وہم ہے کہ جس کو خود قدرت کا ہاتھ براہ راست پال رہا تھا، اس کی پرورش کی تہمت اس کے سر جوڑی جاتی ہے، جس کی اگر سمجھا جائے تو شاید عمر کا ایک پیشتر حصہ اسی کے بل بوتے پر گزرا، جوان کا پروردہ (پالا ہوا) سمجھا جاتا ہے۔

دائی حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا

فہموں کی قلابازیاں اس مسئلہ میں بھی تقریباً اسی قسم کی ہیں جو حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کے متعلق سمجھ کے پھیر سے بلاوجہ پیدا ہوئیں۔

آپ کو حلیمہ سعدیہ سے دودھ ملا، حلیمہ یا حلیمہ کی اونٹنی، حلیمہ کی بکریوں، حلیمہ کے شوہر، حلیمہ کے بچوں بلکہ آخر میں قبیلہ والوں تک کو، ان سب کو، دودھ آپ ہی کے ذریعہ سے ملا؟ اس میں واقعہ کیا ہے؟ اس کو سب جانتے ہیں، لیکن نہیں جانتے یا نہیں جاننا چاہتے ہیں۔

---

[1] قراریط: خاص وزن کے معمولی سکوں کو کہتے ہیں۔

[2] حضرت ابو طالب نے معاشی مشکلات سے تنگ آکر بالآخر اپنے ایک بیٹے جعفر طیار رضی اللہ عنہ کو اپنے بھائی عباس رضی اللہ عنہ کے حوالہ پرورش کے لئے کردیا تھا، اسی طرح دوسرے بیٹے حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کردیئے گئے تھے، ماسوا اس کے تقریباً سیرت و تاریخ کی عام کتابوں میں حضرت ابو طالب کی جزء معاشی تنگ حالی کی داستان موجود تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو آٹھ نو سال کا ان کا یتیم بھتیجا بکریوں کے چرانے پر کیوں مجبور ہوتا۔

ملک عرب

کہتے ہیں کہ اپنی ماتا (ماں) سے آدمی آزاد ہو سکتا ہے، لیکن دھرتی ماتا (مادری وطن) کی غلامی کا طوق (بھاری زنجیر) کس کی گردن میں نہیں کہ آدمی کے بچوں کو جو کچھ ملتا ہے، زمین ہی کی چھاتی (سینے) سے ملتا ہے، وہ جو کچھ کھاتا ہے، جو کچھ پیتا ہے، جو کچھ پہنتا ہے، جس میں رہتا ہے، حتیٰ کہ جس میں بالآخر دفن ہوتا ہے، زمین اور زمین زادوں کے سوا کوئی اور چیز ہے؟ اس جھوٹ میں سچ کا کتنا حصہ ہے؟ اس کے لئے دیکھو کہ اس واقعی آزدی کی راہ درست کرنے کے لئے وہ اس سرزمین سے اٹھایا جاتا ہے جو ایسی ہر چیز کے پیدا کرنے میں عقیم اور بانجھ ہے، جن کی متعلق کہا جاتا ہے کہ آدمی ان ہی پر جی رہا ہے، جن چیزوں سے زندگی پیدا ہوتی ہے عجیب بات ہے کہ ان کی پیدائش کا اس زمین میں امکان نہیں اور جن سے موت کی پیداوار ہوتی ہے، شاید دنیا کا یہ علاقہ اسی کا جہان ہے، اسی کا مکان ہے، جھلسانے والی لو، تپتی ہوئی ریگ، جلے ہوئے گرم پہاڑ، یہ اور اسی قسم کی چیزوں پر اس "غَیْرَ ذِیْ زَرْعٍ" (ناقابل زراعت و کاشت) وادی کی بنیاد ہے اور ان ہی تباہیوں سے یہ بن (بغیر) کھیتی کا بیابان آباد ہے۔

جو باطل پروردگاروں کی بندگی سے مسجود ملائکہ (انسان) کی ذریت (نسل) کو رستگاری (نجات دلانے) بخشنے آیا تھا، اس کے دعویٰ کا تجربی ثبوت اس شکل میں کس درجہ بے نقاب ہو کر سامنے آیا جب وہ اسی سرزمین سے سر اٹھا کر دنیا کو دعوت دیتا ہے، کیا اس کے دعویٰ میں زور اس سے پیدا ہوتا کہ وہ کشمیر کی گل ریز (پھول بکھیرتی ہوئی) کیاریوں، سوئٹزرلینڈ کی نزہت انگیز (تر و تازہ خوشبودار) وادیوں، شام کے فواکہ خیز (پھلوں سے بھرے ہوئے) باغوں سے عالم کو پکارتا کہ:

جو نظر آتے ہیں نہیں اپنے
جو ہے اپنا نظر نہیں آتا

(حضرت امجد)

ان ملکوں میں جو کچھ نظر آتا ہے، ان سرابی مغالطوں کے چکروں میں گھوم کر کتنے پیاسے پیاس ہی کی حالت میں یہ بڑبڑاتے ہوئے ہمیشہ کے لئے تہ نشین ہو گئے کہ جو ان کی ایک انچی (Inch) آنکھوں میں نہیں ہے، وہ واقع میں بھی نہیں ہے، حالانکہ اگر محسوسات کی نظر فریبیوں کے پھندوں سے ان کی عقل کی گردنیں آزاد ہوتیں تو وہ اسے اپنی آنکھوں میں بھی اسی طرح پاتے، جس طرح وہ ان کے باہر پایا جاتا ہے، بہر حال جس دیس میں کچھ نہیں تھا جب اس نے خود اپنی ذات سے اس کی گواہی ادا کی کہ وہاں بھی وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو ان دیسوں میں بھی کسی کو نہیں ملا اور نہ کبھی مل سکتا ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہاں کیا کچھ نہیں ہے؟ کیا اس عینی شہادت کے بعد کوئی کسی دیس کے بندھو (وطن دوست، وطن پرست) یا کسی وطن کے عبد ہونے کا دھوکا کھا سکتا ہے۔

قریش اور قریش کی حالت

اور جس طرح اس نے خاک اور دھول کے بوجھ سے انسانیت کے سر کو ہلکا کیا۔ کیا دعویٰ پیش کرنے سے پہلے قدرت نے خود اس کو، اس کے مبارک وجود کو، اس کی دلیل نہیں بنایا کہ قوم اور نیشن (Nation) کے دیوتاؤں کے آگے بھجن (مذہبی گیت) گانے والے اس کے قدموں پر اس لئے اپنی اور اپنے بچوں کے خون کی، یہ سمجھ کر بھینٹ چڑھانے (قربانی اور نذر دینے) والے کہ قوم کے وجود میں افراد کی ضمانت مستور (چھپی ہوئی) ہے، یہ لوگ قومی اور انفرادی بقاء ہی نہیں بلکہ سرے سے بقاء ہی کے راز سے جاہل ہیں۔

دیکھو! جس طرح وہ ایسے ملک میں پیدا ہوا تھا جس میں کچھ نہیں تھا، اسی طرح یہ قدرت ہی کی طرف کی بات تھی کہ جس قوم میں وہ پیدا ہوا، اس کے پاس بھی کچھ نہیں تھا، وہ اس کا دماغ، اس کا دل، اس کی طبیعت، اپنی قوم سے کیا لیتی جب کہ خود ان ہی کے پاس کچھ نہ تھا اور اگر کچھ تھا بھی تو جو باہر کا حال تھا، وہی ان کے اندر کی بھی کیفیت تھی، بلکہ شاید ان کے دل ان کے پہاڑوں سے زیادہ سخت، ان کے دماغ ان کے میدانوں سے زیادہ چٹیل (خالی) تھے، ان میں ان کی صحبتوں میں رہنے والوں کے اندر سنوار سے زیادہ بگاڑ پیدا ہوتا تھا، ابھرنے سے زیادہ ان میں پلنے والے ٹھٹھر تے تھے۔

تاہم وہ آدمی ہی تھے اور مکہ بادیہ (گاؤں) نہیں ایک شہر تھا، مانا کہ اس میں مدرسہ نہ تھا، کالج نہ تھا، یونیورسٹی نہ تھی، سوسائٹی نہ تھی، کلب نہ تھا، لان نہ تھا، صنعتی کارخانے نہ تھے، علمی معہد، کوئی باضابطہ سیاسی ادارہ نہ تھا، لیکن پھر بھی وہ شہر تھا اس میں شہریت کے کچھ لوازم تھے، ایک معبد تھا، جس کی زیارت کے لئے اطراف واکناف کے مسافر وہاں آتے تھے، شمالی وجنوبی کاروانی راستوں کی شاہراہ پر وہ واقع تھا۔

ایام طفولیت اور شغل گلہ بانی

شک کی اس ٹٹی (پردے) کو بھی توڑنے کے لئے غالباً یہ غیبی سامان تھا کہ جب تک ان سے آپ کچھ لے سکتے تھے، اس عمر تک خانگی حالات کی مجبوریوں نے شہر اور شہریت سے جدا کر کے آپ کو جنگل پہنچا دیا، بجائے آدمیوں کے چراگاہ کے، چرندے آپ کے ساتھی ٹھہرائے گئے، مشغلہ تجارت میں مشغول ہونے سے پہلے تقریباً بائیس تیئس سال کی عمر تک آپ کے اوقات کا یہی نظام تھا کہ صبح ہوئی، گھر گھر سے بکریوں کے مُندوں (ریوڑ)، اونٹوں کے گلوں کو ساتھ لئے بہت دور صحرا میں چلے جاتے، شام ہوئی، سب کے

گھروں کے مویشی (جانور) پہنچادیئے گئے، گھر پہنچے جو کچھ دیا گیا، کھالیا اور تھکے ہوئے گلہ بانوں (چرواہوں) کی طرح بنی نوع انسان کا یہ سب سے بڑا گلہ بان (چرواہا) سوجاتا تھا، شہر میں کیا ہوتا ہے، کون آتا ہے، کون جاتا ہے، شاید ہی اس کی خبر کبھی ملتی ہو، اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ گلہ بانی کی اس پوری زندگی میں صرف ایک دفعہ جیسا کہ عمر کا تقاضا ہے، کسی بارات کے تماشا دیکھنے کا خیال پیدا ہوا، شاید اسی شوق میں چراگاہ سے سویرے واپس آگئے، شام ہوئی، ضروریات سے فارغ ہوکر صاحب تقریب کے مکان پر پہنچے، برات کی دھوم دھام ابھی شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ چراگاہ کی تگ ودو (دوڑ دھوپ) کی ماندگی (تھکن) نے تھپکیاں دے کر سلا دیا، آنکھ کھلی تو تماشے ختم ہوچکے تھے اور مشرق کا رقاص (سورج) افق عالم پر ناچتا ہوا اپنا تماشا پیش کر رہا تھا، دھوپ نکل چکی تھی۔

یہ حال تو اس وقت کا ہے جب اپنی قوم سے آپ کچھ لے سکتے تھے لیکن جب قدرت نے اس کو، جس کے دماغ نے، جس کے قلب نے، جس کی عقل نے، جس کی طبیعت نے محسوس قوتوں میں سے، کسی سے قطعاً کچھ نہیں لیا تھا س، اسی کو ساری دنیا میں ان سب چیزوں کو بانٹنے پر مامور کیا جو آج تک کسی کو کسی سے نہ ملا تھا اور نہ آئندہ مل سکتا ہے، جیسا کہ مسیح علیہ السلام نے کہا تھا۔

> ”میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ تمہیں کہوں، پر تم برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ فارقلیط (احمد) آئے گا تو سچائی کی ساری راہیں بتادے گا۔“ (یوحنا باب ۱۶-۱۳)

ظاہر ہے کہ فرض کے اس منصب پر قیام کے بعد اس کی قوم کا اس کے ساتھ جو سلوک شروع ہوا، ایسی صورت میں ان سے اس کو کیا مل سکتا تھا، جب وہ اس کی ہر چیز بلکہ جان تک چھیننے کے لئے ہر وقت آمادہ رہتے تھے، پھر جس کو اپنی قوم سے کچھ نہیں ملا، نہ علم

ملا، نہ عمل ملا کہ اس سے تو وہ خود کورے تھے، لیکن اپنی آزادی کی حفاظت کے لئے ان میں جو قومی حمیت اور خاندانی غیرت کا جاہلانہ جوش تھا، دیکھو تو وہ اس سے بھی محروم کیا گیا، لیکن کیا اس نے علیٰ رؤس الاشہاد (لوگوں کے سامنے اعلانیہ) خود اپنی ہستی کی شہادت سے یہ ثابت کر کے نہیں دکھایا کہ نہ اس کو ملتا ہے جسے قوم چاہے اور نہ اسی کو ملتا ہے جو قوم سے چاہے، بلکہ جس کا سب کچھ چاہا ہوا ہے، جس کسی کو بھی جو ملتا ہے اسی کے چاہنے سے ملتا ہے ،کون شک کر سکتا ہے اس دعویٰ کی سب سے بڑی دلیل وہ خود تھا، اس کی زندگی تھی۔

حجر اسود کا جھگڑا

مگر بایں ہمہ قوم سے اس وقت تک جدا رہتا تھا جب تک ان کے احسان کا موقع ہوتا، لیکن اسی کے ساتھ یہ عجیب بات ہے کہ جوں ہی قوم پر احسان کرنے کی کوئی گھڑی آئی، لوگوں نے اس کو اس کی قوم میں ملا ہوا، اور کھڑا ہوا پایا، حجر اسود کے فتنہ میں قریب تھا کہ قریش اپنے امن وعافیت کے آبگینہ (شیشہ) کو چکنا چور کریں، لیکن دیکھو! بیابان میں انسانوں سے جدا ہو کر چوپایوں کے ساتھ رہنے والا آتا ہے اور جو درندوں کے مانند، ٹھیک درندوں کے مانند ایک دوسرے کی بوٹیاں نوچنے والے تھے، ان پھٹنے والوں کو کتنی آسانی سے جوڑ دیتا ہے، آڑے وقتوں کے یہی تجربات تھے، جس نے باوجود الگ تھلگ رہنے کے اس کی قوم جیسے سنگین دلوں پر اس کے امین وصادق ہونے کا نقش کندہ کر دیا تھا تاکہ کہنے والے کی وہ بات پوری ہو جو صدیوں پہلے کہی گئی تھی:

> ''وہ امین صادق کہلاتا ہے اور اس کا ایک نام لکھا ہوا ہے جسے، اس کے ماسوا کوئی نہیں جانتا۔''
>
> (مکاشفہ یوحنا باب ۱۹۔۱۱)

یوں ہی وہ اپنی زندگی کی مختلف منزلوں میں پدری قوت، مادری قوت، خاندانی

قوت، وطنی قوت، قومی قوت، ہر ایک کو بڑے زور سے توڑتا پھوڑتا، جھٹلاتا ہوا مسلسل چلا آیا۔

مگر اب جو دعویٰ سے پہلے اس کی دلیلوں کی تعمیر میں ردّوں پر ردّے [1] (تہہ پر تہہ) جماتا چلا آرہا تھا ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں سب کو حیرت تھی کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔

نکاح

تم دیکھ چکے ہو کہ اتنی عمر میں دنیا کے نوجوان کچھ نہ کچھ حاصل کر لیتے ہیں، اس نے کچھ حاصل نہیں کیا تھا، اور جس کو انسان سے زیادہ حیوانوں میں رہنا پڑا، محسوس ومرئی (نظر آنے والی) قوتوں کے اسیروں کی نگاہیں آخر اس میں کیا پا سکتی تھیں، جس کی وہ قیمت لگاتے!

یہ سچ ہے کہ اس کا خاندان عالی اور بلا مبالغہ اتنا عالی تھا کہ ایسی بزرگی وشرافت بنی آدم کے کسی گھرانے کو میسر نہ آئی، اس وقت ہی نہیں بلکہ اس وقت بھی زمین کی آبادی کا تقریباً دوثلث (دوتہائی) حصہ اسی دودمان عالی (اونچے خاندان) کے نفوس قدسیہ (نیک لوگوں) کی حلقہ بگوشی (فرمان برداری) پر ناز کر رہا ہے، مسلمانوں کے علاوہ کون نہیں جانتا کہ دنیا کے سارے یہودی ونصرانی اپنی ساری بزرگیوں اور شرافتوں کو اسی کے جدا کبر ابراہیم علیہ السلام پر ختم کرتے ہیں، پھر ابراہیم علیہ السلام کے بچوں میں بھی جو بچہ کسی معمولی عراقی عورت کے بطن سے نہیں بلکہ شہنشاہ مصر کی صاحبزادی سے پیدا ہوا تھا اور جو ابراہیم وہاجرہ دونوں کے دکھ کی آواز کا لاہوتی [2] جواب تھا، جس کا نام ہی اسماعیل (اللہ کا سنا ہوا) تھا، وہی جس کو کعبہ کے رب نے قبول کیا، اور جس کی بنیاد پر ابراہیم کو دنیا کی امامت کا منصب جلیل (عظیم رتبہ) عطا ہوا، وہ اس آنے والے کا دادا تھا جو دنیا میں بڑی شان سے آرہا تھا۔

خاندان کی اس عالمگیری برتری کے سوا، خود عرب کے جزیرہ نما میں قریش والوں

---

[1] ردّا / ردّہ: تعمیر کرتے وقت اینٹ پر اینٹ یا مٹی کی تہہ پر تہہ رکھنا۔ [م-ع-ا]

سے نسباً کون اونچا تھا؟ اور قریشیوں میں بھی قصی وہاشم کے گھرانے کو سب کے سامنے اپنی بے نظیر خدمات کے صلہ میں عزت وکرامت کا جو مقام حاصل ہوا تھا، عرب میں کون تھا جو اس کی برابری کرسکتا تھا، کندھا ملانے کی کوششیں ضرور جاری تھیں لیکن ان کے دوش (کندھے) کی بلندیوں تک اس وقت تک کس کا دوش پہنچا تھا'

یہ سب کچھ تھا لیکن نقد پرستوں کے جس گروہ سے اس وقت سابقہ تھا، ان کی کوتہ نگاہی (ناسمجھی) اور تنگ ظرفیوں (کم ہمتی) کے آگے ماضی کے اس ادھار عظمت کی کیا قیمت تھی؟ جس بچے کا باپ بھی نہیں ہے، ماں بھی نہیں ہے، دادا بھی نہیں، سرپرستوں میں اگر کسی ایک آدھ چچا کا نام لیا جاتا ہے تو وہ بھی اپنی معاشی بدحالیوں میں الجھا ہوا ہے، ڈگریوں کا تو خیر وہ زمانہ نہ تھا، لیکن سرمایہ اور صلاحیتوں کا سوال تو ہر زمانہ میں رہا ہے، اس وقت بھی تھا، ظاہر ہے کہ جس نے اپنی پوری زندگی بیابانوں میں بکریوں کی رکھوالی اور اونٹوں کی شبانی (چرواہی) میں صرف چند قراریط (سکوں) پر گزاری تھی، اس کی طرف یہ نگاہیں کس طرح اٹھتیں، جن میں مادیات ومحسوسات کے سوا کسی اور چیز کی گنجائش نہ تھی، وہی جو کسی کو نادیدہ حسن ظن یا گمان، پر "دیدہ" کے یقین کو کسی طرح قربان کرنے کے لئے تیار نہ تھے، انہوں نے اگر اس میں "صداقت وامانت" کی کرنیں پائی بھی تھیں تو کیا وہ اس "صداقت" اور اس "امانت" پر دولت وثروت کی خواہش کو ذبح کرنے کی سکت رکھتے تھے۔

جاہل، غریب بت پرستوں سے کیا امید کی جاسکتی ہے، جب خدا پرستی، صداقت شعاری کے تعلیم یافتہ مدعیوں (دعویٰ کرنے والوں) کو بھی ہم اپنے سامنے اس حال میں پارہے ہیں، جس میں شاید عرب کے یہ اُجڈ گنوار (غیر مہذب) بھی غالباً مبتلا نہ تھے۔

مگر وہی بات جس کی دلیل ہمیشہ دعویٰ کے آگے آگے چلی آرہی تھی، یہاں بھی اچانک وہی دلیل ایک عجیب شان میں دفعۃً چہرہ پرداز (ظاہر) ہوئی۔

غریب حجاز کا سب سے بڑا امیر شہر مکہ تھا اور مکہ کے تمام امیروں کے پاس مجموعی طور پر جو کچھ تھا، انفرادی طور پر اسی قدر دولت کی مالکہ اس شہر کی وہ بزرگ بی بی تھیں، جن کا اسم گرامی ''طاہرہ'' ؎۱ اور ''خدیجۃ الکبریٰ'' (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) تھا، گویا اس حساب سے صرف مکہ کی نہیں بلکہ سارے حجاز کی سب سے بڑی دولت مند خاتون آپ تھیں، قدرت کی یہ عجیب کارفرمائی تھی کہ چند پیسوں کے لئے جس کو دن بھر ببولوں کے کانٹوں اور اذخر کے گھانسوں کی تلاش میں جنگل جنگل پھرنا پڑتا تھا، اسی کو خدیجہ اور خدیجہ کے پاس جو کچھ تھا، سب دلا کر، جسے لوگوں نے سب سے نیچا خیال کیا تھا، سبھوں سے اونچا کر دیا، تاکہ پھر ثابت ہو کہ امیری کے چاہنے والے اور اس کے لئے زمین کے قلابے (کڑیاں) آسمانوں سے ملانے والے امیر نہیں بنتے، بلکہ امیر وہی ہوتا ہے، جس کے ہاتھ میں لوگوں کی امیری بھی ہے، اور غریبی بھی، جس دعویٰ کو وہ لے کر حرا سے بعد کو آیا، دیکھتے جاؤ! کہ کن پیکروں (صورتوں) میں اس کی دلیلیں کہاں کہاں سے اُبل اُبل کر جریدۂ عالم (دنیا کے نقشے پر) پر ثبت ہو رہی ہیں۔

ایسا دعویٰ کس نے سنا اور ایسی دلیل کس نے دیکھی؟ دعویٰ سنایا گیا اور دلیل دکھائی گئی، عالم استدلال و برہان کی قطعاً یہ انوکھی چیز ہے (صلوٰۃ اللہ علیہ وسلامہ) اور دیکھو کہ اسی کے ساتھ ایک روشنی ہے، جس میں پڑھنے والے چاہیں تو پڑھ سکتے ہیں کہ آئندہ جو جنبش ہوئی وہ اس سے نہیں ہوئی کہ افلاس (غربت) نے کسی کو مضطرب کیا ہے! ناداری سے کوئی تڑپا ہے!۔

؎۱ دیکھو سیرت النبی، شبلی مرحوم، ذکر خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔

خلوت پسندی

بہر حال امیری جب آتی ہے تو اپنی شانوں [شان] کے ساتھ آتی ہے، ٹھاٹھ کے ساتھ آتی ہے، باٹھ (شان وشوکت) کے ساتھ آتی ہے، لیکن جس کو قصر (محل) میں براجنے (آرام سے رہنے) کا موقع دیا گیا، تلاش کرو! وہ ویرانوں میں ملے گا، مکہ کے رئیس اپنی کوٹھیوں میں ہیں اور طائف کے امراء پھلوں اور پھولوں سے لدے باغوں اور ان کے بنگلوں میں ہیں، لیکن جو سب سے بڑی امارت کا مختار کل (مکمل اختیار) اور متصرف مجاز (تصرف کی اجازت) ہے، وہ پہاڑوں کے اندھیرے غاروں میں ہے، پھر جو سرمایہ اس کو ملا، کیا وہ مہاجنی (سوداگروں) کے بازاروں میں ہے؟ رشتوں کو جوڑا گیا، مہمانوں کو کھلایا گیا، بے کاروں کو کموایا گیا، بار (بوجھ) والوں کا بوجھ ہلکا کیا گیا، نادانوں کو سکھایا گیا، بپت (مصیبت) کی گھڑیوں میں لٹایا گیا، یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی کی رپورٹ ہے، جس میں ان کی دولت کام آئی۔ [بخاری وغیرہ کتب صحاح]

پھر جوان میں چھوٹا تھا وہ بڑا ہو چکا تھا، مال میں بڑا ہو چکا تھا، جاہ میں بڑا ہو چکا تھا، اور اپنے ہم چشموں، ہم عصروں، ہم زادوں سب میں سب سے بڑا ہو چکا تھا، آخر اس سے زیادہ بڑائی کس کو حاصل تھی! کالے پتھر (حجر اسود) کے لیے سرخ خون کی جو ندی بہنے والی تھی، جس کے اکیلے ہاتھ نے اس طوفان کا رخ پلٹ دیا تھا، جس کے گھر کا مہمان ہمیشہ اکرام کے ساتھ واپس ہوا، جس کے دامنِ دولت کے نیچے یتیموں کو پناہ ملی، جو بے روزگاروں کو روزگار دلانے کا روزگار کرتا تھا، جو بے ہنروں کو ہنر سکھواتا تھا، بھاری بوجھ والوں کا بار (بوجھ) اٹھاتا تھا، وہ آڑے (مشکل) وقتوں میں آڑ (سہارا) بنتا تھا، جو کچھ قدرت نے اس تک پہنچایا تھا وہ اس کو ان ہی راہوں میں بہاتا رہا۔

جس نے نیکی کی اتنی پیچ در پیچ (نہایت مشکل) شاخوں میں اپنا سارا سرمایہ ساری توانائی لگادی تھی، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کے بعد شہرت وعظمت، جاہ وجلال (عزت وبزرگی) کی جو بلندیاں اسے میسر آئیں، ایسی برتری ان میں کس کو نصیب ہوئی تھی، مال وثروت کی دیویوں یا مندروں میں ''صدق وامانت'' جیسی صفات کی مانا کہ پرستش نہ ہوتی ہو،لیکن کیا جاہ (عزت) کے اکھاڑوں میں کردار کی ان قوتوں سے بازی نہیں جیتی جاتی؟ اور بلاشبہ وہ صرف اپنے شہر میں نہیں بلکہ اس شہر میں جہاں جہان بھر کے لوگ آتے تھے، اور کون بتاسکتا ہے کہ کہاں کہاں کے لوگ آتے تھے، زیارت کے لئے بھی آتے تھے اور تجارت کے لئے بھی آتے جاتے تھے، ان سب علاقوں میں خطوں میں، بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ ملکوں میں بھی، ان ہی راہوں سے اس کا نام اونچا ہو چکا تھا، جاہ (عزت) کے لئے اس وقت جو کچھ سوچا جاسکتا تھا، یقیناوہ سب اس کو حاصل ہو چکا تھا، اور مالی بڑائی میں جس کنگرہ (اونچائی) پر اس کی برتری کا پھریرہ (جھنڈا) اڑ رہا تھا اس کا تماشا تم کر چکے ہو۔

پس جو چیز اُسے محلوں میں مل چکی تھی، کتنی بڑی بے ایمانی، اور کیسی گندی اور سیاہ کور باطنی (کینہ)، بے بنیاد بداندیشی ہوگی کہ اسی کا بہتان اس پر لگایا جائے، جب وہ ہفتوں، عشروں غاروں میں، دن ہی نہیں بلکہ ڈراؤنی اور بھیانک راتیں گزارتا تھا، سانپوں اور بچھوؤں، درندوں اور موذیوں (تکلیف دینے والے) سے بھرے ہوئے پہاڑوں اور ٹاپوؤں (جزیروں) میں اس کو ان ہی چیزوں کے لئے جانے کی کیا ضرورت تھی جو مخملی طنفسوں (غالیچوں)[1]، ریشمی قالینوں، عبقری (بے مثال خوب صورت) گدوں،

---

[1] طنفس، عبقری: یہ عربی زبان کے عام الفاظ ہیں، جو جاہلیت میں مروج تھے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی چیزیں جاہلی تمدن میں پائی جاتی تھیں، طنفسہ زرابی: مختلف اقسام کی بچھانے کی چادریں۔ نمارق: تکیے، قرآن میں بھی ان الفاظ کا ذکر آیا ہے: ﴿وَنَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ وَزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ﴾

مرزکش (نقش ونگار سے مزین) چھپرکھٹوں [1] پر بے فکر و تردد، اگر وہ چاہتا تو بہ آسانی یوں بھی مل سکتی تھی، اور وہ تو ملی ہوئی تھی، لیکن اس نے بجائے ایرانی زرابی (غالیچہ)، رومی نمارق (تکیہ) کے زمین اور کھلی زمین کے پتھریلے فرش کو اپنا بچھونا اور خارا (سخت پتھروں کو اپنا تکیہ بنایا۔

بی بی کی عصمت کا پتہ بے چارگی میں نہیں چلتا، چارہ ہو اور عصمت ہو، عصمت اسی کا نام ہے، خاک کے فرش کے سوا جس کے پاس کوئی فرش نہیں، وہ اگر خاک پر سویا تو کیا خاک سویا، جو تخت پر سو سکتا ہے وہ مٹی پر سویا، اسی کا سونا (Gold) ایسا خالص سونا ہے جس میں کھوٹ نہیں ہے، اور یہ تو اس امتحان گاہ کی جس میں اب وہ اتارا جاتا ہے پہلی منزل ہے، جانچنے والے جانچ لیں، پرکھنے والے پرکھ لیں اور جس طرح سے جن جن امکانی شکلوں سے چاہیں جو کچھ اس کے اندر ہے اس کو باہر لانے کی کوششیں کریں۔

اپنے اپنے معیاروں کو لے کر آؤ؟ اپنی اپنی کسوٹیوں (سونے کی جانچ پرکھ کا پتھر) کو لے کر دوڑو! کسو [2]! کس کر دیکھو! کہ جس کو قدرت کے ہاتھوں نے خالص اور آلائشوں سے قطعاً پاک بالکل صاف پیدا کیا ہے صداقت و راستی، امانت و اخلاص کے سوا اس میں کوئی اور چیز بھی ہے، خوب کف گیریں (بڑا چمچہ) مار مار کر دیکھو! کیا اس دیگ کا کوئی چاول کچا ہے، روشنی کی جو کرنیں اس کے اندر سے پھوٹ پھوٹ کر دنیا کو جگمگا رہی ہیں، گھورو! آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورو! خردبینوں کو آنکھوں پر چڑھا چڑھا کر گھورو! تاریکی کا اس میں کوئی ریشہ (دھاگہ، تار) ہے؟

---

[1] چھپرکھٹ: وہ پلنگ جس پر چھت ہو، چھتری والا پلنگ۔ [م-ع-ا]

[2] کسو: سونے کو کسوٹی پر لگا کر اس کے کھرے اور کھوٹ کی پہچان کرنے کے عمل کو کس دیکھنا کہا جاتا ہے۔ [م-ع-ا]

نبی مان لینے کے بعد کس کی ہمت تھی کہ اس قدوسی سرشت (پاکیزہ طبیعت) کے امتحان کا اندیشہ بھی کرتا، یہی مصلحت تھی کہ ایک مہینہ نہیں، دو مہینے نہیں، سال دو سال بھی نہیں، بلکہ تم میں کون نہیں جانتا کہ مکی زندگی کے پورے تیرہ سال اسی حال میں اس کو گزارنے پڑے کہ گویا اس کو کوئی نہیں جانے گا، گویا اس کو کوئی نہیں مانے گا، حالانکہ پھر اسی کو نہیں بلکہ اس کے ان کفش برداروں (جوتی اٹھانے اور خدمت کرنے والے یعنی صحابہ کرام) نے تقریباً اسی بارہ تیرہ سال کی مدت میں صرف جزیرۃ العرب ہی نہیں بلکہ مشرق و مغرب، ایشیا و افریقہ کے لاکھوں میل کے رقبوں کو ایسے کروڑہا کروڑ انسانوں سے بھر دیا کہ گویا ان میں کوئی انکار کرنے والا تھا ہی نہیں، فاروق رضی اللہ عنہ ہی کے پندرہ سالہ عہد حکومت تک پہنچتے پہنچتے ایسا ہو گیا جیسا کہ حبقوق نبی نے صدیوں پہلے کہا تھا:

"آسمان اس کی شوکت سے چھپ گیا، اور زمین احمد کی حمد سے بھر گئی، وہ کھڑا ہوا، اس نے زمین کو لرزا دیا، اس نے نگاہ کی، اور قوموں کو پراگندہ کر دیا، قدیم پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گئے، پرانی پہاڑیاں اس کے آگے ریزہ ریزہ ہو گئیں زمین مدیان [1] کے پردے کانپ جاتے تھے۔"

ابتداء وحی

اب دیکھو! خلوت کی اسی زندگی سے وہ ایک بڑے دعوئ کو لے کر آتا ہے ٹھیک اسی طرح آتا ہے جیسا کہ سلیمان نبی نے کہا تھا:

"وہ میرے محبوب کی آواز دیکھ! وہ پہاڑوں پر سے کودتے، ٹیلوں پر سے پھاندتے آتا ہے۔" (غزل الغزلات باب ۱)

---

[1] مدیان اور مدیانی: بائبل کی زبان میں مکہ والوں کو کہتے ہیں، دیکھو: "القول الصحیح للعلامۃ الاستاذ الفراھی"۔

اور پہاڑ سے اتر کر، دنیا کے آگئے، اس نے حیرت سے بھرے ہوئے اس تجربہ کا اعلان کیا کہ جیسے کہ یسعیاہ نبی نے کہا تھا:

''ان پڑھ کو کتاب دی گئی کہ اسے پڑھ اور وہ کہتا ہے کہ میں ان پڑھ ہوں، پڑھ نہیں سکتا۔'' (یسعیاہ باب ۲۹)

سمجھنے والوں نے سمجھا یا نہیں سمجھا، مجھے اس سے کیا بحث۔ لیکن بخاری میں ہے حرا کی کھوہ میں اس کے سامنے سب سے پہلے "فجئه الحق" [1] کا نظارہ اسی طرح بے نقاب ہوا، جس طرح پہاڑی کے ہرے بھرے جھاڑ کی شاداب آگ سے:

﴿إِنَّنِي أَنَا اللهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا﴾

ہاں! میں ہی اللہ ہوں، کوئی معبود نہیں ہے لیکن میں ہی

کی سرمدی (ہمیشہ رہنے والی) گونج اس طرح گونجی کہ سننے والا نہیں بتا سکتا کہ کدھر سے گونجی، لیکن گونجی، اور اسی آگ سے گونجی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یوں ہی محسوس ہوا، اور یہ تو قرآن میں ہے، غیر قرآنی یادداشتوں میں آیا ہے کہ پیپل کے سایہ میں جو مایوس بیٹھا تھا، گیا کا وہی شاکیہ منی [2] یہ کہتا ہوا اچھلا:

''پا گیا، پا گیا اب تجھے نہیں کھوؤں گا، جی گیا، جی گیا اب کبھی نہیں مروں گا۔'' (اوکما قال)

خدا ہی جانتا ہے کہ بدھ کیا تھا، کون تھا اور اس نے کہا کیا تھا، لوگوں نے کیا سنا،

---

[1] بخاری میں ابتداء وحی کی جو حدیث ہے اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ غار حرا میں پہلے آپ کے سامنے ''اچانک حق نمودار ہوا'' یہ "فجئه الحق" کا ترجمہ ہے، اس کے بعد "فجاءه الملك" تب فرشتہ آیا، عام شارحین بخاری نے دونوں کا حاصل ایک ہی قرار دیا ہے، یعنی اس حق کو جو اچانک نمودار ہوا تھا، فرشتہ کا آنا تفسیر ہے، لیکن دو مستقل واقعات کو ایک ٹھہرانے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

[2] شاکیہ منی بدھ مت کے بانی سدھارتھ گوتم بدھ کو کہا جاتا ہے۔ [م-ع-ا]

لیکن بھولے بسرے افسانوں میں ذکر چلا آتا ہے کہ کچھ اسی قسم کے الفاظ بولا۔

بہر حال حق کے اس فجائی (ایک دَم) اور اچانک نمود کے بعد بخاری ہی میں ہے کہ "فجاءه الملك" تب فرشتہ آیا۔

ملک ہی حق تھا، اور حق ہی ملک تھا، جو یہ کہتے ہیں، اب ان سے میں یہ کیا کہوں کہ جس نے چکھا اسی نے جانا، ہم نے نہ چکھا اور نہ جان سکتے ہیں، ہمارے سامنے تو دعویٰ پیش ہوا، بڑا عجیب وغریب دعویٰ، دل ہلا دینے والا دعویٰ جو دیکھ نہیں سکتے انہیں کیسے دکھایا جاسکتا تھا، نابیناؤں کے لئے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ بیناؤں کی سنیں، بخت کا چھوٹا وہ ہے جو خود بھی نہیں دیکھ سکتا اور دیکھنے والوں نے جو دیکھا ہے یہ بدنصیب اس کے سننے سے بھی پیٹھ پھیرتا ہے، گردن موڑتا ہے۔

لیکن جاننے سے پہلے کون مان سکتا ہے، جانو تب مانو، پہنچا نو تب جھکو، یقین کی فطری راہ یہی ہے، تم آفتاب ہی کو نہ دیکھو یہ تمہارے بس میں ہے، لیکن جو سورج کے سامنے کھڑا تھا، اس نے اپنی ایک پلک کو دوسری پلک سے اگر جدا کر لیا تو اب اس کے قابو میں ہے کہ وہ آفتاب اور اس کی چمک کو جھٹلائے! آگ کے چھونے پر کوئی مجبوری نہیں ہے لیکن چھونے کے بعد گرمی کے ماننے سے کون گریز کرسکتا ہے؟

بجنسہ کچھ اسی طرح دیکھو کہ حرا کے دامن سے صدق وامانت کا آفتاب چڑھا، چڑھ کر انسانیت کے اس حاسہ (محسوس کرنے کی قوت) کے سامنے آکر ٹھہر گیا جس سے سچ جانا جاتا ہے، ممکن ہے کہ جس طرح لاکھوں میں کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو بینائی کی فطری قوت سے محروم ہو یا شنوائی (سننے) کا حاسہ (حِس) اس سے مسلوب (چھین لیا گیا) ہو، لیکن سب اندھے ہوں، سب بہرے ہوں جس طرح یہ ناممکن ہے، اسی طرح یہ بھی محال ہے کہ آدمی ہو اور اس میں "سچ" اور "سچائی" کے یافت (پانے) کا حاسہ (حِس) نہ ہو، "یہ ڈاکٹر

ہے اور وہ ڈاکٹر نہیں ہے' اسی فیصلہ پر جانیں سپرد کی جاتی ہیں، آنکھوں میں نشتر (زخم کو چیرنے والا چھری نما آلہ) چبھوائے جاتے ہیں۔

اس ٹرین کو سب نہیں ہنکاتے ہیں جو بیابانوں میں چلتی ہے، چڑھائیوں پر چڑھتی ہے، ذخار اور خونی دریاؤں کے پلوں سے گزرتی ہے، فیصلہ کی وہی قوت جو ڈرائیور کو غیر ڈرائیور سے، شوفر (ڈرائیور) کو غیر شوفر سے جدا کر کے ہم میں اطمینان پیدا کرتی ہے کہ اپنا سب کچھ سونپ کر ہم اپنے کو، اپنے بال بچوں کو، اپنے مال واسباب کو ریل کے ڈبوں میں ڈال دیتے ہیں، سچ کو جھوٹ سے اگر جدا کرنے کا حاسہ ہم میں نہ ہوتا تو ڈاکٹر اور ڈرائیور کیا؟ زندگی کے کسی شعبہ کی گاڑی ایک سیکنڈ کے لئے بھی چل سکتی ہے؟

اور یہی وجہ ہے کہ سلبی (منفی) یا ایجابی (مثبت) کون سی شکل باقی رہی جس معیار پر سچائی کی یہ ''لاہوتی'' [1] حقیقت نہ پرکھی گئی، زر لے کر دوڑے، زمین لے کر دوڑے، زن لے کر دوڑے، الغرض جو کچھ سوچا جا سکتا ہے، ہر ایک سے رگڑ رگڑ کر، گھس گھس کر انہوں نے جانچا، لیکن صدق وامانت کے احساس کی وہی گرفت جو دعویٰ سے پہلے ان کے دلوں پر مسلط تھی، کسی تدبیر سے ڈھیلی نہیں پڑتی تھی، اس میں کیا ہے؟ اس کے اندر کیا ہے؟ مال ہے؟ جاہ ہے؟ یا کچھ اور ہے؟ ہر سوال کی سلائیاں، لمبی لمبی سلائیاں ڈال ڈال کر ہر ایک نے دیکھا، بار بار دیکھا، لیکن ''سچ'' کے سوا اس میں کچھ نہیں ہے، اخلاص کے سوا اس میں کچھ نہیں ہے، ہر آزمائش، ہر جانچ کا آخری نتیجہ یہی برآمد ہوا، جانچ کی یہ ایجابی شکلیں تھیں، اس راہ سے انہیں کچھ نہیں ملا۔

اب وہ منفی وسلبی تدبیروں کے متعلق باہم ایک دوسرے سے مشورہ کرنے لگے، ''دارالندوہ'' کی مجلسی سرگرمیاں جتنی اس وقت تیز ہوئیں، اس کی تاریخ میں ایسی گرم

---

[1] لاہوت: عالم ذات الٰہی جس میں سالک کو فنافی اللہ کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ [م-ع-ا]

بازاری اسے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

مسلو! اس کے باطن کو مسلو! متھو! اس کے اندر جو کچھ ہے، سب کو متھو (پیشانی پر مارنا)! املو! دلو (پیسو)! اور جس جس جتن سے جو کچھ ممکن ہے، سب کچھ کر گزرو! قدرت نے اس کا بھی ان کو وسیع موقع بغیر کسی مزاحمت کے، بڑی فیاضی کے ساتھ، اتنی فیاضی کے ساتھ جس کی نظیر حق وراستی کے تجربہ کی تاریخ میں قطعاً مفقود ہے، عطا فرمایا۔

جو کیا کچھ نہیں کر سکتا تھا! اور جب اجازت ہو گئی تو کیا کر کے اس نے نہیں دکھا دیا، وہی اس وقت سکون تام، صبر مطلق کا ایک کامل مجسمہ بن کر اپنے کو، اپنے ظاہر و باطن کو ان میں ہر ایک کے آگے ڈالے ہوئے تھے۔

جانچ کی اس راہ میں پھر کیا کیا پیش ہوا، بجز اس کے جس میں اسی درجہ کا صدق ہو جو اس میں تھا، اسی درجہ کی امانت ہو جو اس میں تھی (اور یہ مقام نسل آدم میں کسی کو میسر آسکتا ہے؟) ان کو کون جھیل سکتا تھا؟۔

تعذیبِ صحابہ رضی اللہ عنہم

اس کے لاوارث بے کس ساتھیوں پر پہلے انہوں نے ہاتھ چھوڑا اور اس طرح چھوڑا کہ چیرہ دستیوں (مظالم) کا کوئی ایسا دقیقہ (ذرّہ) نہ تھا جسے انہوں نے رکھ چھوڑا، دہکتے ہوئے کوئلوں پر زندہ کھال والی پیٹھیں، ننگی پیٹھیں لٹائی گئیں، جلتی ہوئی ریت پر جانداروں کو سلایا گیا۔

کتے جب مر جاتے ہیں تب ان کی ٹانگوں میں رسی باندھ کر مہتر (چمار، بھنگی) گھسیٹتے ہیں لیکن قریش کے مہتروں (سرداروں) میں ایسے مہتر بھی تھے، جنہوں نے جیتے جاگتے آدمیوں کے گلے میں رسیاں باندھیں اور مکہ کی گلیوں میں ان ہی رسیوں کے ساتھ وہ

گھسیٹے گئے، گرم پتھروں پر کھلے بدن کے ساتھ کوڑے مار مار کر، ''سچ'' کو چھوڑ کر جھوٹ بولنے کے لئے تڑپائے گئے، تلملائے گئے، چٹائیوں میں باندھ کر ناک کی راہ سے تیز وتند ایند ھنوں کا دھواں پہنچایا گیا، جن پر یہ گزر رہی تھی ان کا جو کچھ امتحان تھا، ظاہر ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس رؤف ورحیم فطرۃ طیبہ (شفیق ومہربان پاکیزہ فطرت) میں جنبش پیدا کرنے کے لئے یہ طوفان اٹھایا گیا تھا، اس کے صبر مطلق اور سکون تام کے لئے یہ بڑا سخت اور کڑا امتحان تھا، اس کے سوا جو وہ اپنے اندر بتاتا تھا اگر کسی چیز کا ادنیٰ شائبہ بھی ہوتا تو اس کے لئے اس کے رقیق قلب (نرم دل)، گداز دل کے لئے یہ منظر نا قابل برداشت تھا، لیکن سب کچھ ہلا دیا گیا اور پوری طاقت کے ساتھ ہلا دیا گیا مگر جو ''سچائی'' کی چٹان پر بٹھایا گیا، بجز آنکھوں میں آنسو بھر لانے کے اس میں کوئی جنبش نہ ہوئی، بوڑھی غریب بے کس عورت کے سر پر انگارے رکھے گئے، اس کے سامنے اس کے شوہر کے سینہ میں برچھا بھونکا (گھونپنا) گیا، حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی والدہ اور والد کی اس جگر شگاف حالت کو دیکھ کر زبان میں اضطراراً حرکت پیدا ہوئی لیکن اس حرکت میں جو آواز آئی وہ صرف یہ تھی:

''عمار کے گھر والو! اللہ تم پر رحم فرمائے، تنگی کے بعد کچھ دور نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ فراخی پیدا کر دے۔''

ہجرتِ حبشہ

چڑیوں کے بھی گھونسلے ہوتے ہیں جن میں وہ پناہ لیتی ہیں اور سانپوں کی بھی بانبیاں (بل) ہوتی ہیں جن میں وہ چھپ کر رگیدنے (پیچھا کرنے) والوں سے اپنی جان بچاتے ہیں، لیکن دعویٰ کے زور کو توڑنے کے لئے ستم کے جو پہاڑ جن غریبوں پر توڑے جا رہے تھے، ان کے پاس تو وہ بھی نہ تھا، ان میں بڑی تعداد ان غلاموں کی

تھی، جن کا نہ اپنا گھر ہوتا ہے اور نہ ڈر (دروازہ)، یا ایسے تھے جو دوسروں کے سہارے زندگی بسر کر رہے تھے، جس پر سہارا ہو جب وہی سہاروں کو ختم کرنے کے درپے ہو جائے تو اب اس کے لئے کہاں پناہ ہے؟ اتنا سرمایہ بھی نہیں تھا کہ عرب کے اس ٹاپو (جزیرے) کو چھوڑ کر خدا کی لمبی چوڑی زمین میں کسی اور جگہ اپنے سجدوں کے لئے جگہ پیدا کریں، اُف! کہ ان کی پیشانیوں کو خدا ہی کی زمین پر زمین کا اتنا ٹکڑا بھی میسر نہ تھا جس پر وہ اپنی پیشانی اپنے خدا کے آگے رکھ سکیں۔

اس کو اپنی جگہ سے ہلانے کے لئے، اس جگہ سے ہلانے کے لئے جس پر قدرت نے بٹھانے والے کو بٹھایا تھا، دوسروں پر یہ دباؤ ڈالا جا رہا تھا، بالآخر اسی کو اپنے سینہ پر پتھر رکھنا پڑا اور اپنی چہیتی صاحبزادی اور محبوب داماد کو آمادہ کیا تا کہ دوسروں کو گھر مل سکے، اپنے گھر، نعمتوں سے بھرے ہوئے گھر کو چھوڑ دو! جلاوطنی کے مصائب سے قطعاً ناواقف نوجوان دولہا اور نویلی دلہن نے سر جھکا دیا اور بن گھروں کو گھر دلانے کے لئے یہ گھر والا سمندر پھاند کر حبشہ پہنچ گیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی رقیہ رضی اللہ عنہا جو ان کی بیوی تھیں ان کو اور مکہ کے غرباء فقراء اور اسی قسم کے ان لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر حبشہ پہنچے، جن کے ماں باپ اعزا، اقربا ایمانداروں کو بے ایمانی پر مجبور کر رہے تھے اور یہ پہلی دفعہ نہیں بلکہ ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ ایمان پر کبھی جبر نہیں کیا گیا، لیکن بے ایمانی پر مجبور کرنے کے واقعات سے تو تاریخ بھری پڑی ہے، اس پر بھی بے ایمانوں نے پھیلایا کہ ایمان ہی جبر سے پھیلا، بہر حال اسی جماعت میں ابوطالب کے نوجوان صاحبزادے جعفر طیار تھے، بڑی کش مکش ہوئی یہ دکھانے کے لئے کہ جانچ کا کام جن کے سپرد تھا انہوں نے جانچنے میں کوئی کمی نہیں کی، پرکھنے کے اس معاملہ کو انہوں نے آخر تک پہنچایا تھا۔

یہ دکھایا گیا کہ امتحان لینے والوں کی اس جماعت نے سلطنتوں کی بھی پرواہ نہ کی،

ہاتھیوں والے بادشاہ کے شاہی دربار تک کے پردہ ہائے جلال کو چاک کرنے کی اگر اس راہ میں ضرورت پیش آئی تو وہ یہ بھی کر گزرے۔

جن کے انہماک ودلچسپی کا حال یہ ہو، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے آزمائش کے سلسلہ میں کوئی دقیقہ اٹھا رکھا ہوگا؟ بادشاہتیں ختم ہوگئیں، سلطنتیں مٹ گئیں، لیکن تاریخ کے اس طویل عرصہ میں دنیا کی جو سلطنت اب تک اپنے پاؤں پر قائم ہے [1] اور جس کو چت (گرانے اور نیچا) کرنے کے لئے سائنس اور کیمیا کے ہتھیاروں سے اس وقت تک کوشش جاری ہے، لیکن دنگل (اکھاڑہ) میں ابھی تک وہ خم ٹھونک (مقابلہ کر) رہی ہے، اسی حبشہ کے تخت کا نجاشی اپنے وزیروں، امیروں، پادریوں کے جھرمٹ میں بیٹھا ہوا ہے اور جو اللہ کے غلاموں کو اپنا غلام بنانے کے لئے آئے ہیں، اچھل رہے ہیں کہ ان کی پیاسی تلواروں کے لئے اب خون دیا جائے گا اور ان کے انگاروں کے لئے اب کباب عطا ہوں گے۔

نجاشی کے دربار میں جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی تاریخی تقریر

لیکن جونہی ایک نوجوان [2] ان کے سامنے ان دیکھی قوت کے ساتھ اٹھ کر کڑکتا ہے:

---

[1] افسوس ہے کہ جس وقت یہ مضمون لکھا جارہا تھا، اس سلطنت کا یہ حال تھا، جو مظلوموں کو پناہ دے کر چودہ سو سال تک قدرت کی پناہ میں آگئے تھے، ان کے ایک بادشاہ نے ظلم کیا، صرف اس لئے ظلم کیا کہ حبشہ کے تخت کا وارث بجائے تین خداؤں کے ایک خدا کا بندہ ہوچکا تھا، یا ہو رہا تھا، غریب منی لک جو سلطنت کا اصلی وارث تھا اسلام کے جرم میں تخت سے محروم کیا گیا، جیل میں ڈالا گیا، ہیلا سلاسی نے اس کو بڑی کامیابی سمجھا، لیکن پروانہ کے خون ناحق نے شمع کو بھی حکومت کرنے کی اجازت نہ دی، ظالم پر ظلم مسلط کیا گیا اور اس سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔

[2] یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی جعفر طیار رضی اللہ عنہ تھے وطن چھوڑنے والوں کے ساتھ حبشہ گئے، آٹھ سال بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مدینہ میں آکر ملے، چند دنوں کے بعد موتہ کی جنگ میں شہید ہوئے، شہادت کے وقت عمر مبارک تیس سال سے کم تھی، چند سال ہوئے کہ نعش مبارک تیرہ سو سال بعد اصلی حالت میں برآمد ہوئی، جسم پر زخموں کے نشان موجود تھے، اخباروں میں یہ خبر چھپی تھی۔

''سن اے بادشاہ! ہم لوگ جاہلیت میں غوطے کھارہے تھے، ہم پتھر کی کھودی ہوئی مورتوں کے آگے جھکتے تھے، ہم مردار کھاتے تھے، ہم بے حیائیوں سے لت پت تھے، ہم رشتوں ناطوں کو کاٹتے تھے، ہم اپنے پڑوسیوں کے لئے صرف دکھ اور رنج تھے، زور والے ہمارے بے زوروں کو نگلتے چلے جارہے تھے کہ اچانک ہم میں اللہ نے اپنے پیغمبر کو اٹھایا، جس کے نسب کو بھی ہم جانتے ہیں، جس کی سچائی کا، صدق کا، امانت کا، پارسائی کا، ہم سب کو تجربہ ہے۔

اسی نے ہمیں اللہ کی طرف پکارا اور حکم کیا کہ ان ساری گندگیوں، ان سارے جھوٹے پتھر کے کھودے ہوئے دیوتاؤں سے ٹوٹ کر جدا ہو جائیں جن کے ساتھ ہم پہلے لپٹے ہوئے تھے۔

اے بادشاہ! اس نے ہم پر اصرار کیا ہے کہ جس کی امانت ہو اس کو واپس کردیں، رشتوں اور برادریوں کو جوڑیں، پڑوسیوں سے حسن سلوک برتیں، اللہ نے جن باتوں سے ٹوکا ہے، جس کے خون سے روکا ہے، ان سے رک جائیں۔

بے شرمی کے کاموں، بے حیائی کے دھندوں کو چھوڑ دیں، اس نے ہمیں منع کیا ہے کہ بناوٹی باتیں نہ بنائیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، پاک باز عورتوں پر تہمت نہ جوڑیں۔ (دہرا کے زور دیتے ہوئے) اس نے ہم کو حکم کیا ہے کہ ہم اللہ ہی کو پوجتے رہیں، کسی کو اس کا ساجھی اور شریک نہ بنائیں۔

اور اس نے ہم پر یہ بھی لازم کیا ہے کہ ہم نماز پڑھیں، زکوٰۃ ادا

کریں اور روزے رکھیں۔

پس ہم اس پر سچا یقین کرتے ہیں، اس کی تصدیق کرتے ہیں اس کی باتوں کو مانتے ہیں، جو کچھ اللہ کے یہاں سے لایا ہے، اس پر ہم چلتے ہیں (پھر پلٹ کر) اسی لئے ہم صرف اللہ ہی کو پوجتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک وسہیم (حصہ دار) نہیں سمجھتے، اللہ نے جن چیزوں کو حرام کیا ہم نے بھی اس کو حرام کیا، جن چیزوں کو اس نے حلال کیا ہم نے بھی ان کو حلال کیا"۔

سناٹا چھا گیا، اپنی زمین کا سب سے مطلق العنان بادشاہ[1] چیخ اٹھا، روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا:

"ایسوں کو کون دے سکتا ہے؟ ان کو کیسے حوالہ کیا جاسکتا ہے؟"

جو لوہا گرم ہوا تھا جب اس کی گرمی کا یہ حال ہے تو جس نے اس کو گرم کیا تھا (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی حرارت کو کون برداشت کرسکتا تھا، مگر وہی جنہوں نے چھوا نہیں تھا یا جو چھونے سے ہچکچا رہے تھے، ورنہ جنہوں نے چھولیا تھا دیکھ رہے ہو کہ یہ آگ کسی طاقت سے بجھ رہی ہے؟ غریبوں سے، امیروں سے، شاہی قوت کے فوارے سے بجھانے کی کوشش کی گئی لیکن بجائے بجھنے کے وہ اور بھڑکی، بجائے دبنے کے وہ اور بھبکی (بھڑکی)، اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ جاننے نہ جاننے، چھونے نہ چھونے، دیکھنے نہ دیکھنے کا سب کو اختیار ہے، لیکن جس نے جان لیا، جس نے چھولیا، جس نے دیکھ لیا، نہ ماننا اس کے بس سے باہر ہو جاتا ہے، حقیقت کی گرفت سے اس کے بعد اپنے کو صرف وہی آزاد دکھا سکتا ہے جو گرفتار ہوتا ہے، لیکن کسی باطنی شرارت کی وجہ سے دعویٰ کرتا ہے کہ میں آزاد ہوں، یہ ہٹ

---

[1] اس بادشاہ کے حالات میری کتاب "اسلام کا سب سے پہلا بادشاہ" میں پڑھیے۔

دھرموں کا گروہ ہے، یہ ڈھٹائی والے معاندین وجاحدین (منکرین) کی جماعت ہے جو جھٹلاتی ہے اور کسی باطنی خبث کی وجہ سے جان بوجھ کر جھٹلاتی ہے، مگر یہ لوگ وہ نہیں تھے جو جاننے ہی سے جان چرا رہے تھے یا دیکھنے سے آنکھیں میچ (بند کر) رہے تھے بلکہ انہوں نے جاننے کے اختیار کو استعمال کیا پھر ماننے سے کیسے باز رہ سکتے تھے، جس نے سورج اور اس کی شعاعوں کو دیکھ لیا، کیا اپنی آنکھ سے ان کے احساس کو پونچھ کر محو (مٹانا) کرسکتا ہے۔

ذات مبارک ﷺ کے ساتھ ایذا رسانیوں کا آغاز

بہر حال یہ تو ان کی جانچ تھی جو گرمائے گئے تھے، لیکن ان تمام گرمیوں کا جو حقیقی منبع اور ان کا گرمانے والا تھا، اب تک اس کے صرف ایجابی امتحانات تک بات پہنچی تھی اس کو تو انہوں نے اس وقت تک مہلت دے کر جانچا تھا جس طرح اس کے ساتھیوں کی جان لے کر، ان کی عزت وآبرو لے کر۔

ان کی جسمانی راحت وآرام کو لے کر، ان سے ان کے جینے کے حق کو چھین کر انہوں نے آزمایا تھا ''صدق وامانت'' کے اس حقیقی سرچشمہ کے ساتھ آزمانے کی اس راہ کو اختیار کرنے سے کچھ جھجک رہے تھے جس کا امتحان تھا، اگرچہ خود اس کو دیدہ اور مرئی (دیکھی ہوئی) قوتوں سے انکار تھا، لیکن ان آزمانے والوں کی نگاہوں، تنگ نگاہوں میں تو بھروسہ صرف وہی تھا جو سامنے ہو، بہر حال اس بھروسہ کی تعداد ہی کتنی سی تھی لیکن جتنی بھی تھی، جب اس میں سے اسی پچاسی آدمی نکل گئے تو ظاہر ہے کہ آزمانے والوں کے لئے راستہ بہت کچھ صاف ہو چکا تھا، یہ سچ ہے کہ جمہور یہ قریش کے بین الفرقی یا بین القبائلی (مختلف فریق اور قبائل کے درمیان طے) قوانین کی رو سے بھی اس پر ہاتھ دراز کرنا آسان نہ تھا جو ان غلاموں، پردیسیوں، بے کسوں کی طرح لاوارث نہ تھا، جن کے ساتھ ان ظالموں نے جور و

ستم (ظلم) کی چاند ماری (نشانہ بازی) ٹھنڈے سانسوں کے ساتھ کھیلی تھی، بنی ہاشم سے بھی دبتے تھے اوران کے حلیفوں (ہم معاہدہ) سے بھی شرماتے تھے، جن کے ساتھ ان کے ''نشانہ'' (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خاندانی تعلق تھا، تاہم زیادہ دن تک وہ صبر نہ کر سکے۔

ابوطالب کو توڑنے کی کوشش

اوراب سلبی آزمائشوں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا، قریش کے گھاگھوں (تجربہ کاروں) کی مجلس نے طے کیا کہ اس کے لئے زیادہ لمبی چوڑی کوششوں کی حاجت نہیں بلکہ ان کی ظاہری آنکھوں کے سامنے اس کی جو سب سے بڑی چٹان تھی، جس پر اگرچہ وہ خود ٹیک لگائے ہوئے نہیں تھا لیکن وہ یہی باور کرتے تھے کہ اس کی سب سے بڑی ٹیک اس کا چچا ابوطالب ہے، طے کیا گیا کہ بس اسی چٹان کو جس طرح بن پڑے، کسی طرح اس کے قدموں کے نیچے سے سرکالو، یقین تھا کہ اسی کے ساتھ وہ اوراس کا دعویٰ دونوں ہی سربسجود ہوجائیں گے، جو کچھ ممکن تھا، اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے کیا، ابتداء میں انہیں کچھ مایوسیاں ہوئیں اوراچھی خاصی مایوسیاں ہوئیں، لیکن واقع میں وہ کس پر کھڑا ہوا ہے، اس کے عینی شاہد کس طرح پیدا ہوتے اگرابوطالب اپنی چالیس سال کی محنت ومحبت کو برباد کرنے پرآمادہ نہ ہوجاتے، تاریخ نے اس دردناک مرقع کی تصویر محفوظ رکھی ہے جس وقت اپنے گودوں کے پالے ہوئے یتیم بھتیجے کو لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں آب دیدہ ہوکر ابوطالب کہہ رہے تھے:

''لا تحملنی ما لا أطیق'' ''مجھ پر اتنا نہ لادو جسے میں اٹھا نہ سکوں''۔

قریش کامیاب ہوگئے، چٹان لڑھک گئی، لیکن قریش ہی نے نہیں بلکہ دنیا نے دیکھا کہ جس کو گرانے کے لئے یہ کیا گیا تھا، وہ جہاں تھا وہاں سے ہلا بھی نہیں، صرف آواز آرہی تھی کہ کہنے والا کہہ رہا ہے:

"خدا کی قسم میرے داہنے ہاتھ میں آفتاب اور بائیں میں ماہتاب اگر اس لئے رکھ دیا جائے کہ میں اس امر کو اپنے ہاتھ سے چھوڑ دوں تو یہ نہیں ہو سکتا۔"

یہ تو ان کی ایجابی کوششوں کی امید، دبی چھپی چنگاریوں کو آخری طور پر بجھانے کے لئے فرمایا گیا اور اس کو تو وہ دیکھ بھی چکے تھے، آفتاب و ماہتاب تو ان کے پاس تھے نہیں لیکن جو کچھ بھی تھا سب کو دے کر وہ مایوس ہو چکے تھے، باقی اب جن سلبی اور ایذائی مہموں کا انہوں نے آغاز کیا تھا اس کے متعلق بھی قطعی لفظوں میں اعلان کر دیا گیا:

"یہ کام پورا ہوگا، یا میں اس میں مر جاؤں گا۔"

کام تو پورا ہونے والا تھا اور اس میں شک کی گنجائش ہی کیا تھی لیکن دے کر تو تم دیکھ چکے، اب لے کر دیکھو! اچھی طرح دیکھو! اس سلبی امتحان کی راہ میں جان تک کی بازی لگا دی گئی اور یہی مطلب تھا:

"أو أهلك فيه"

"یا میں اس میں مر جاؤں گا یا مارا جاؤں گا۔"

سنگ دل، سیاہ سینہ، جانچنے والوں نے پھر کیا اس سلسلہ میں کہیں رحم کھایا؟ جو کچھ کر سکتے تھے، سب کچھ کر رہے تھے، لیکن ان کا کہیں دل دکھا؟ عزت پر، آبرو پر، جسم پر، جان پر حملوں کی کوئی قسم تھی جس کو انہوں نے باقی چھوڑا، یقیناً ان کے ترکش میں کوئی تیر ایسا نہ تھا جو چلنے سے رہ گیا، نکاحی بیٹیوں کو طلاق دلوائی گئی[1]، سر پر خاک ڈالی گئی، راہ میں

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیوں کا نکاح ابولہب کے دونوں لڑکوں سے ہو چکا تھا، رخصتی نہیں ہوئی تھی، صرف آبروریزی کے خیال سے ابولہب نے اپنے لڑکوں کو حکم دیا کہ طلاق دے دیں، عرب کے شریف گھرانوں میں طلاق بڑی بے عزتی کی بات تھی۔

کانٹے بچھائے گئے، پشت پر لید سے بھری ہوئی اوجھ (اوجھڑی) نماز کی حالت میں رکھی گئی، چہرہ مبارک پر بلغم تھوکا گیا، گردن مبارک میں پھندا لگایا گیا۔[1]

شعب ابی طالب

اور آخر میں سب جانتے ہیں کہ کھانا بند کیا گیا، پانی بند کیا گیا، زندگی کے تمام ذرائع روکے گئے، ایک ماہ دو ماہ نہیں، پورے تین سال تک ابی طالب کی گھاٹی میں اسی طرح رہنے پر مجبور کیا گیا، خود ان کو مجبور کیا گیا اور ان کے ساتھ بوڑھے ابو طالب اور معصوم بچے، ناتواں عورتیں جو بنی ہاشم اور چند دوسرے خاندانوں کی تھیں، اسی حال میں ڈالے گئے۔

وہی فطرت رحیمہ ورؤفہ (مہربان وشفیق فطرت) جو انسان تو انسان کسی جانور کے دکھ کو بھی دیکھ کر تڑپ جاتی تھی، اس کے لئے آزمائش کی کیسی کڑی گھڑی تھی کہ ننھے ننھے بچے اس لئے بلبلاتے تھے کہ ان کی ماؤں کی چھاتی میں دودھ نہیں ہے، آٹھ آٹھ دن، دس دس دن ان کے منہ میں اڑ کر کوئی کھیل (قلیل مقدار) بھی نہیں پہنچی ہے، کیا سخت وقت ہے کہ پیشاب سے شرابور خشک چمڑے کو دھو کر بھون بھون کر ان کو کھانا پڑا، جن کے دانتوں نے شاید سوکھا گوشت بھی نہیں چبایا تھا[2]، جو پتے شاید بکریاں بھی شوق سے نہ کھائیں، ان پر ہفتوں بسر کرنا پڑا، مصیبت کی ان چیخوں، تکلیف کی ان پکاروں میں اس حساس فطرت طیبہ کے لئے کیسی عظیم بے چینی تھی، اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں، جن کے دل میں درد ہو، اور جو درد والوں کے لئے اپنے اندر کوئی ٹیس رکھتے ہوں، لیکن یہاں تو باسن کو ظاہر کر کے دکھانا تھا، چھوڑ دیا گیا تھا، تاکہ کریدنے والے جہاں تک ممکن ہو کریدیں، وہ مسل رہے

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھو میری کتاب ''مصائب النبی صلی اللہ علیہ وسلم''۔

[2] فاتح ایران حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ یہ واقعہ شعب ابی طالب میں پیش آیا۔

تھے رگڑ رہے تھے، انگلیاں ڈال ڈال کر ٹٹول رہے تھے کہ جو کچھ ظاہر کیا جا رہا ہے، کیا اندر میں کچھ بھی کہیں بھی اس کے سوا کچھ ہے، تجربے کرنے والوں کے لئے تجربے کے سارے سازوسامان، تمام آلات واوزار ایک ایک کر کے مہیا کر دیئے گئے تھے کہ آئندہ ان ہی کو گواہی دینی تھی، ان ہی کو دنیا کے آگے فرض شہادت ادا کرنا تھا۔

شعب ابی طالب کے مصائب کی قیمت

واقعہ معراج

ابوطالب کے شعب کا مرحلہ بھی ختم ہو گیا، یہاں دنیا کی ہر چیز سے جدا کئے گئے تھے، اور جدائی کی رفتار کو گھاٹی کے ستم زدوں (مظلوم) کے شوروفغاں (فریاد) نے اور تیز کر دیا تھا، جو فطرتاً دنیا اور دنیا والوں سے کچھ جدا ہی جدا سا تھا، جب قصداً بھی اس کو جدا کیا گیا اور ایسے سخت دباؤ ڈال ڈال کر جدا کیا گیا جس سے زیادہ دباؤ اس رقیق قلب (نرم دل) کے لئے ممکن نہ تھا، سمجھا جا سکتا ہے کہ کائنات سے جدائی کی اس رفتار نے آخر کسی دوسرے جانب ارتقاء کی کتنی منزلیں طے کی ہوں گی، جس چیز کو ایک طرف سے دباؤ گے تو دوسری طرف اس کا ابھرنا ناگزیر ہے، ستر (چھپانے) اور خاموشی سے کام لیا جاتا تو خود عقل قیاس (اندازہ) کرتی کہ اس دباؤ نے کسی دوسری سمت کتنا ابھار پیدا کیا ہوگا۔

لوگ سوچتے نہیں ورنہ جب شعب ابی طالب سے نکلنے کے ساتھ ہی کہنے والے نے حرا کے واقعہ سے بھی زیادہ قدرت کی نادرہ نمائی (انوکھی صورت) کا اظہار کیا تو جن پر ابھی اس شب کی روشنی نہیں کھلی تھی، جس میں ''ان پڑھ کو کتاب دی گئی'' وہی کہنے لگے کہ ایک رات میں اتنا عروج ایسا عروج کس طرح میسر آیا۔

واقعہ معراج کے متعلق چند ارشادات

ان بھولے بھالوں سے کوئی کیا کہہ سکتا ہے، آخر جو نیچے سے دبایا گیا اور مسلسل اتنی بے دردیوں سے دبایا گیا اور وہ دبتا ہی چلا گیا، کس قدر عجیب بات ہے کہ اسی کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اوپر کی طرف کس طرح چڑھا اور کیوں چڑھتا گیا، جن کو یہی نہیں معلوم ہے کہ عالم کیا ہے؟ انسان کیا ہے؟ اور دونوں کا بنانے والا کیا ہے؟ عالم انسان میں ہے یا انسان عالم میں ہے؟ جن پر یہی معمہ (پہیلی) نہیں کھلا ہے تو پھر وہ اس گرہ کو کیا کھول سکتے ہیں جن میں انسان اپنے خالق کے ساتھ بندھا ہوا ہے، خالق عرش پر بھی ہے اور جس کو خلیفہ اور آدمی کہتے ہیں، وہی جس میں خالق کی روح پھونکی گئی ہے، اس کی گردن کی ورید (شہ رگ) کے پاس بھی عرش ہی والا خالق ہے۔

جب تک ان متناقضات (اضداد) کے تناقض (اختلاف) کو تم سلجھا نہیں سکتے اس قسم کے ژولیدہ (بکھرے ہوئے) حقائق کی گتھیوں میں کیوں الجھتے ہو؟ جو نہ روح کو جانتے ہیں اور نہ جسم کو، وہی باہم ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے ہیں کہ کیا یہ واقعہ روح کے ساتھ پیش آیا یا جسم کے ساتھ؟ جسم کے ساتھ پیش آیا تو کیا؟ اور روح کے ساتھ پیش آیا تو کیا؟ جن کی سمجھ میں دونوں پہلوؤں میں سے ایک پہلو بھی نہیں آتا وہ ان دوشقوں (حصوں، قسموں) سے ایک کا تعین آخر کس بنیاد پر کرتے ہیں؟ ہستی کا جو تناور درخت تمہارے سامنے کھڑا ہے اور جس کے مختلف حصوں کے نام خاک وآب (مٹی، پانی) وآتش وباد (آگ، ہوا) وسفلیات (پستی) وعلویات (بلندی)، ارض وسماوات، مرئیات (جو دیکھنے میں آئے) وغیر مرئیات (دیکھنے میں نہ آئے) ہیں وہی جس سے تمہارے سامنے

فرات ونیل[1] یا گنگا و جمنا کی موجیں بھی ابلتی ہیں اور پھر اسی سے ان عالموں میں جہاں تمہاری اور تمہاری بینائی کی رسائی نہیں، تسنیم و کوثر کی نہریں بھی پھوٹی ہیں، تم کو کیا معلوم کہ اس درخت کی جڑ کہاں ہے اور اس کی پھنگ (آخری سرا) وجود کی کس شکل پر ختم ہوئی ہے، نہ دیکھنے والے کیوں منہ تکتے ہیں، جب دیکھنے والے نے کہا کہ وہ ''سدرۃ المنتہیٰ''[2] ہے، مٹی ہی گیہوں ہے اور گیہوں ہی روٹی ہے، روٹی ہی خون ہے اور خون ہی گوشت ہے اور گوشت ہی کہیں آنکھ ہے، کہیں جگر ہے، کہیں ہڈی ہے اور کہیں ناخن ہے، ایک ہی وجود تمہیں مختلف پیرایوں میں کیا کیا نظر آیا، پھر اگر کسی نے شجر وجود ہی کے اندر سے نیل وفرات کو بھی اور تسنیم و سلسبیل (جنت کی نہر) کو بھی نکلتے دیکھا تو غلط کیوں دیکھا، جب دودھ پلایا گیا تو ''أصبت الفطرة''[3] کی آواز آئی، ایک صفت اگر دوسرے عالم میں دودھ کے رنگ میں دیکھی گئی تو پھر جھوٹ کی شکل دوسری دنیا میں اگر پتھر بن جائے، حسد کی شکل بچھو کی ہو، حرص چوہے کی شکل میں دوڑتا دکھائی دے تو اس پر حیرت کیا ہے؟ یقیناً انسان میں دونوں خواہشیں ہیں، حیوانی بھی اور ملکوتی (فرشتوں جیسی) بھی، پھر حیوانی خواہشوں پر قابو پانے والوں کو اپنی یہ خواہش کسی حیوان ہی کے بھیس میں نظر آئے تو اس میں حیرت کیا ہے؟ وہ سفید ہو، براق ہو برق رفتار ہو، اتنا برق رفتار ہو کہ جہاں اس کی نظر پہنچتی ہو، وہیں

---

[1] معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ''سدرۃ المنتہیٰ'' کی جڑوں سے جنت کی نہروں کو بہتے دیکھا اور فرات ونیل کو بھی اسی کے اندر سے پھوٹتے پایا، آپ کے اس بیان ہی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ''سدرۃ المنتہیٰ'' کوئی ایسی حقیقت ہے جو محسوس اور نامحسوس عالموں میں بطور قدر مشترک کے ہے، تفصیل کے لئے دیکھو ''حجۃ اللہ البالغہ'' شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور میری کتاب ''المعراج''۔

[2] ساتویں آسمان پر بیری کا بہت بلند درخت جو جبرائیل علیہ السلام کی پرواز کی انتہا ہے۔ [م-ع-ا]

[3] اس حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ معراج کے موقعہ پر جبریل میرے پاس ایک برتن میں شراب اور ایک برتن میں دودھ لائے تو میں نے دودھ لے لیا، جبریل نے کہا: آپ نے فطرت کو اختیار کرلیا۔ [م-ع-ا]

اپنے قدم رکھتا ہو، وہ گھوڑوں جیسا بے ڈول لمبا نہ ہو، گدھوں جیسا ذلیل پست نہ ہو، معتدل ہو، موزوں قامت ہو، سب کچھ ہو لیکن رہے گا وہ حیوان ہی۔

کیا کیا جائے بڑی نشانیاں یا آیات کبریٰ[1] کا سیاح چھوٹی نشانیوں یا صغریٰ آیات کے اندر رہنے والوں کو کس طرح سمجھائے کہ وہ کہاں کہاں گیا؟ کب گیا؟ کس طرح گیا؟۔

اس بہرے کو جو نور کے عالم کی سیر کر چکا تھا، جب آواز کی اس دنیا میں چلنے کے لئے کہا گیا جو موروں کی جھنکاروں، شیروں کی ڈکاروں، چڑیوں کی چہچہوں، چکوروں کے قہقہوں سے معمور تھی تو اس نے پوچھا کہ آواز کی دنیا؟ کتنی دور؟ کس پر؟ کتنی دیر میں پہنچا جا سکتا ہے؟ حالانکہ کان کا پردہ اٹھا، اور یہ سارے سوالات کافور (ختم ہو چکے) تھے، جس کے صدر کا شرح ہوا، جس کا سینہ کھولا گیا، جس کے ظاہری حواس کے ساتھ باطنی احساسات بھی جگا دیے گئے، لوگ اس کو سن کر پریشان کیوں ہوتے ہیں حالانکہ جن کے لطائف واسرار (نفس کی باطنی صفات و کیفیات) صاف ہیں اور ان لطائف کو تو تقریباً ہر شخص صاف کر سکتا ہے، ان سے اگر پوچھا جاتا تو اس کی تصدیق کرتے۔

اور بات یہ ہے کہ جو کچھ دکھایا جانے والا تھا کیا ہوا، اگر کسی خاص شان میں وہ کچھ دن پہلے دکھایا گیا، ہزار ہا پیغمبروں سے کل آٹھ پیغمبروں اور ان میں بھی آدم سے شروع کر کے معمار کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زیارت پر، اس شخص کی ملاقات کیوں ختم ہوگئی، جو آدم کی طرح اپنے وطن سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچا اور جب مکہ فتح ہو گیا اس کا کام بھی ختم

---

[1] قرآن کی جس آیت میں اسراء یعنی معراج کا ذکر ہے، اس میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ اپنے بندے کو اس لئے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی جانب رات کو لے گیا، تاکہ ''سب اپنی نشانیاں'' اس کو دکھائے اور دوسری جگہ جہاں اسی واقعہ کا ذکر ہے، وہاں نشانیوں کو آیات کبریٰ بڑی نشانیاں قرار دیا ہے۔

ہوگیا، جس نے دیکھا اور جنہیں دیکھایا گیا[1]، دونوں کی زندگیوں پر غور کرو، نظر آئے گا کہ جو ہونے والا تھا وہ کسی رنگ میں اس وقت ہو رہا تھا، حالانکہ ان ہی واقعات کے سلسلہ میں جب صرف ''زندگی'' نہیں بلکہ ''امانت کبریٰ'' کی زندگی، اقصیٰ کی مسجد میں دکھائی گئی تو اس وقت آٹھ ہی نہیں بلکہ دنیا کے سارے پیغمبر اس امام کے پیچھے کھڑے نظر آئے جو نوع انسان کا سب سے بڑا امام ہے۔ اللّٰھمّ صلّ علیہ وسلّم

اور سچ یہ ہے کہ جس کو سچا مانا گیا، اس کے ہر ہر ''سچ'' پر دلوں میں شک کا ابھار، یقین کرو کہ اس ماننے کا بداہۃً (ظاہرا) انکار اور اس ایمان سے یہ قطعاً ارتداد (پھر جانا) ہے، ''مرتد'' ہوا جس نے انکار کیا اور ''صدیق'' ٹھہرا جس نے اقرار کیا۔

اُف! میں بہت دور نکل گیا، لیکن دور ہونے والوں کو قریب کرنے کے لئے کچھ دیر ہوئی تو وہ دیر نہیں ہے، بہر حال یہ بات ہو رہی تھی کہ جو ایک طرف سے اگر دبایا گیا تو اچنبھا (تعجب) کیوں ہے کہ وہ دوسری سمت میں دور اور اتنی دور کیوں چلا گیا، آخر قدرتی طور پر یہ نہ ہوتا تو ہوتا کیا م اور اسی کا نتیجہ تو یہ ہوا کہ جن کو بار بار جاننے کے لئے، اپنی

---

[1] پہلے آسمان پر آدم، دوسرے پر عیسیٰ ویحییٰ، تیسرے پر ادریس، چوتھے پر ہارون، پانچویں پر یوسف، چھٹے پر موسیٰ، ساتویں پر ابراہیم علیہم السلام کو دکھایا گیا، آدم نے جس طرح اپنے وطن جنت سے نکل کر دنیا کی ہجرت کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ (وطن) سے نکل کر مدینہ پہنچے، مدینہ میں یہودی فتنہ نے آپ کو اسی طرح گھیرا کہ جس طرح عیسیٰ ویحییٰ علیہما السلام ان میں گھرے، ادریس علیہ السلام کتابت کے موجد تھے، بدر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں نوشت وخواند کو مروج کیا حتیٰ کہ ہر خواندہ قیدی سے دس بچوں کو لکھنا سکھا دینا فدیہ مقرر ہوا، ادریس کے بعد آپ نے سلاطین کے نام خطوط روانہ کئے، آگے جس طرح ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل میں ہر دلعزیز تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضی اللہ عنہم میں محبوب تھے، پھر حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے وطن ثانوی مصر میں جو اقتدار حاصل ہوا وہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دور ہجرت مدینہ طیبہ میں چند سالوں کے بعد حاصل ہوگیا، پھر جس طرح حضرت موسیٰ نے وطن فلسطین پر مصر سے حملہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر حملہ کیا اور اس کو مشرکوں کے اقتدار سے آزاد کرایا، ابراہیم علیہ السلام بانی کعبہ تھے، کعبہ پر قبضہ کر کے پھر اس کو ابراہیم علیہ السلام کی مسجد بنا دیا، اسی پر زندگی ختم ہوگئی۔

آنکھیں کھولنے کے لئے کہا جاتا تھا، بظاہران کی تکذیب میں تیزی پیدا ہوئی، لیکن یہ باطن ان کی تفتیش میں اس دعویٰ نے اور تندہی (محنت ومشقت) پیدا کردی اور اب امتحانی راہوں میں وہ ایسی باتیں سوچنے لگے جن کے بعد پھر کچھ نہیں سوچا جاتا۔

حضرت ابوطالب اور خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات

وہ ادھر اپنے آخری منصوبے پکار رہے تھے کہ وقتوں کے ساتھ اس بندھی ہوئی دنیا میں ان دو آدمیوں کا وقت ختم ہو گیا۔

جو جانچا جا رہا تھا اس کے لئے واقعہ کے اعتبار سے یہ کچھ نہ ہوں لیکن عام بشری قانون کی رو سے ان کو بہت کچھ سمجھا جاتا ہے، شکی شک کرتے تھے کہ ملنے کے وقت یہی دونوں تھام لیتے ہیں، ٹوٹنے کے وقت بھی یہی دونوں ڈھارس باندھ دیتے ہیں۔

الغرض حضرت ابو طالب بھی چل بسے اور سب سے پہلے ایمان لانے والی خاتون، دنیا کی ایمان والیوں کی پیشوا (رضی اللہ عنہا) نے اپنا کام پورا کر کے چھوڑ دیا، امتحان کے میدان میں تنہا چھوڑ دیا تاکہ تسلی کے الزام کا یہ شوشہ بھی کٹ جائے، مٹ جائے اور وہ کٹ گیا، مٹ گیا، لیکن امتحان دینے والا امتحان کے میدان میں اسی طرح ڈٹا ہوا تھا اور ان تمام حالات کے ساتھ ڈٹا ہوا تھا جو اس پر گزر رہے تھے، گزارے جا رہے تھے۔

لیکن کب تک؟ حبشہ والے حبشہ میں تھے، دنیا والے آخرت میں، مکہ والوں کے پاس امتحانی مدت کے دس سال سے زیادہ گزر چکے تھے، جانچ کی کون سی شکل تھی جو باقی رہ گئی تھی بجز اس ایک منصوبے کے جو آخری منصوبہ تھا۔

طائف کو روانگی

یہ نہیں سنتے شاید دوسرے سنیں، یہاں جی نہیں لگتا، شاید وہاں لگے، کچھ یہی سوچ کر زیادہ دور نہیں بلکہ امراء مکہ کے گرمائی اسٹیشن طائف کا خیال آیا، زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ آزاد

غلام کے سوا ساتھ بھی کوئی نہ تھا، حجاز کی سب سے بڑی دولت مند عورت خود بھی جا چکی تھی اور جو کچھ ان کا تھا ان ہی راہوں میں جن پر وہ صرف ہو رہا تھا، صرف ہو چکا تھا، سب کچھ جا چکا تھا، اتنا بھی باقی نہ تھا کہ طائف تک کے لئے کوئی سواری ہی کرایہ پر کر لی جائے، معمولی دو چپلوں کے سوا پائے مبارک کے لئے راستہ کو آسان کرنے والی کوئی چیز نہ تھی، اسی حال میں پہنچے، پہنچتے ہی اونچی دکانوں والوں کے پاس آئے، جس لئے آئے تھے اس کا اظہار کیا گیا، پھر تمام تجربوں میں یہ آخری تجربہ تھا کہ جس کسی کے پاس گئے اسی نے پلٹایا، جس سے بولے اسی نے جھڑکا، حالانکہ کم از کم اجنبی لوگوں کا سلوک ابتداءً آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کبھی ایسا نہ تھا، اور نہ روداد از پیغمبر کے (اور نہ پیغمبر کے بیان کردہ احوال و سرگزشت کے مطابق)، مزوں کے ہوتے ہوئے ابتداءً فطرت بشری ایسا کر سکتی ہے، مگر یہاں بھی دکھایا جا رہا ہے اور عجب شانوں کے ساتھ دکھایا جا رہا ہے، جنہیں کچھ نہیں آتا تھا ان کی زبانوں پر منطق جاری ہوئی:

”جسے سفر کے لئے ایک گدھا بھی میسر نہیں، کیا خدا کو اس کے سوا رسول بنانے کے لئے اور کوئی نہیں ملتا تھا؟“

ٹوٹے ہوئے دل کے لئے یہ پہلا تیر تھا جو امارت کے نشہ میں چور ایک امیر کی زبان سے نکلا:

”ردائے کعبہ تار تار ہو جائے، اگر خدا نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا ہے۔“

کعبہ کی عظمت جس کی نگاہ میں ان بتوں کے ساتھ وابستہ تھی جو مختلف قبائل کی خدائی کے نام سے وہاں رکھے گئے اور اس کے خیال میں ان ہی بتوں نے سارے عرب کو کعبہ کے ساتھ باندھ رکھا تھا، اس نے اپنا یہ سیاسی نظریہ پیش کیا:

”تم اگر رسول ہو تو میں اس کا مستحق نہیں ہوں کہ تم سے

بولوں، اور اگر نہیں ہو تو میری ذلت ہے کہ کسی جھوٹے سے بولوں۔"

یہ ان میں سے تیسرے کی منطق تھی۔

جو سب کے لئے تھا اور سب کے لئے ہے، قیامت تک کے لئے ہے، کیسا دردناک نظارہ ہے، اسی کو سب واپس کر رہے تھے، تیز و تلخ جملوں کے ساتھ واپس کر رہے تھے، بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی کہ انہوں نے جو پیش ہوا تھا اس کو صرف رد کر دیا، بلکہ آگ میں پھاند نے والوں کی جو کمریں پکڑ پکڑ کر گھسیٹ رہا تھا[1]، وہی کمر کے بل گرایا جاتا تھا، پتھر مار مار کر گرایا جاتا تھا، گھٹنے چور ہو گئے، پنڈلیاں گھائل (زخمی) ہو گئیں، کپڑے لال ہو گئے، معصوم خون سے لال ہو گئے، نو عمر رفیق نے سڑک سے بے ہوشی کی حالت میں جس طرح بن پڑا اٹھایا، پانی کے کسی گڑھے کے کنارے لایا، جوتیاں اتارنی چاہیں تو خون کے گوند سے وہ تلوے کے ساتھ اس طرح چپک گئی تھیں کہ ان کا چھڑانا دشوار تھا۔

اور کیا کیا گزری! کہاں تک اس کی تفصیل کی جائے، خلاصہ یہ ہے کہ طائف میں وہ پیش آیا جو کبھی نہیں پیش آیا۔[2]

---

[1] بخاری و مسلم کی اس مشہور حدیث کا ترجمہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مثلی و مثلکم انا اخذ بحجزکم عن النار" میری مثال تمہارے ساتھ ایسی ہے کہ میں تم لوگوں کی کمریں پکڑ کر آگ سے کھینچ رہا ہوں۔

[2] جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ طائف امراء مکہ کا گرمائی مستقر تھا ان کے باغ، باغ میں بنگلے یہاں بکثرت بنے ہوئے تھے، واپسی کے وقت آنحضرت ﷺ جس باغ میں ٹھہر گئے تھے یہ عتبہ و ربیعہ قریش کے دو رئیسوں کا باغ تھا، بنگلے سے ان کی نظر حضور پر پڑی، گو دشمن تھے لیکن عرب اور قریش تھے دل نہ مانا، اپنے عیسائی غلام عداس کی معرفت ایک پلیٹ میں انگور کے چند خوشے انہوں نے حضور ﷺ کے پاس بھیجے، قبول فرما لیا گیا اور بسم اللہ کر کے تناول فرمانا شروع کیا، عداس کو آپ کی بسم اللہ پر حیرت ہوئی، پوچھنے پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا میں اللہ کا رسول ہوں، عداس رضی اللہ عنہ یہ سن کر قدموں پر گر کر بوسے دینے لگا۔

لیکن کیا طائف کی بات صرف اسی پر ختم ہو جاتی ہے، سڑک مڑ رہی تھی لیکن لوگوں نے راستہ کو سیدھا خیال کیا، چوراہے پر کھڑے تھے لیکن کوئی نہیں ٹھٹکا (ٹھہرا)، حالانکہ بخاری میں سب سے بڑی مصیبت کے سوال میں جب یہ ذاتی اقرار موجود تھا:

"كان أشد ما لقيت منهم يوم العقبة إذ عرضت نفسي على ابن عبد يا ليل"

سب سے زیادہ سخت اذیت ان سے (نہ ماننے والوں سے) مجھے اس گھاٹی میں طائف کے دن پہنچی، جس دن میں نے عبد یالیل کے بیٹے پر اپنے کو پیش کیا تھا۔

تو لوگوں نے اُحد اور اُحد کے پہاڑوں کو کیوں یاد کیا؟ لیکن جو اُحد کے مقابلہ میں طائف کو یاد کرتا تھا اس کو سب بھول گئے، پوچھا بھی گیا تھا:

"هل اتى عليك يوم كان أشد عليك من أحد؟"

"کیا آپ پر اُحد کے دن سے بھی زیادہ سخت دن آیا؟"

اسی کے جواب میں جس پر گزری اس نے طائف پیش کیا، تو جن پر نہیں گزری اب ان سے کیا پوچھا جائے؟ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ٹھیک جس طرح ابی طالب کی گھاٹی میں جو ایک طرف سے دبایا گیا تو دوسری سمت وہ بلند ہوا اور اتنا بلند ہوا کہ ارض وسماوات سفلیات وعلویات، مرئیات وغیر مرئیات، حتیٰ کہ جس پر سب ختم ہوتے ہیں منتہی کا یہ سدرہ بھی اسی کے احاطہ میں آ گیا۔

بجنسہ کچھ اسی طرح طائف کی گھاٹی میں جو واپس کیا گیا اور اس طرح واپس کیا گیا کہ جن سے ملتے وہی پھٹتا، جس سے چمٹتے وہی سمٹتا، جس کو بلاتے وہی دُردُراتا (دھتکارتا)، جس سے جوڑتے وہی توڑتا، انکار کی یہ آخری حد تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ آپ سے ٹکرا رہا ہے جو ہے رد کر رہا ہے۔

اگر یہ ہورہا تھا اور دن کی روشنی میں ہورہا تھا تو کیوں نہ سمجھا گیا کہ جس قدرت کے ہر منفی قانون کی انتہا مثبت پر ہوتی ہے جس کے ہر عمل کی تان ردعمل پر ٹوٹتی ہے "عمل در عمل" کی گتھیوں میں گتھی ہوئی اس دنیا میں جب یہ واقعہ یوں ہی ہورہا تھا تو بلاشبہ صفا کے دامن سے جس انکار کی ابتداء ہوئی تھی، طائف کی اس گھاٹی میں اس کی انتہا ہوگئی۔

جو رد کیا گیا، قبول کیا جائے گا جو ہنکایا گیا، بلایا جائے گا، جو گرایا گیا، اٹھایا جائے گا، عقل کا مقتضی تھا کہ ایسا ہوتا اور شاید کہ ایسا ہی ہوا۔

مگر اس دنیا کی رِیت (روایت) یہی ہے کہ مسبب (سبب پیدا کرنے والا) ہمیشہ سبب کے رنگ میں آتا ہے، اصل نقل کے بھیس میں آتا ہے، کس قدر عجیب ہے، امتحان وابتلاء (آزمائش) کی اس طویل مکی زندگی میں "پڑ رہی تھی اور جھیل رہا تھا" اس نظارہ کے سوا اور کوئی تماشا کبھی پیش نہیں ہوا، لیکن جب مکہ کے ان ہی واقعات کا تکملہ (مکمل رتمام ہونا) طائف میں ہوتا ہے تو دیکھو جو شروع ہوا تھا وہ اپنے انتہائی نقطہ پر پہنچ کر ختم ہوگیا۔

طائف سے واپسی

زید نے تو شہر سے باہر نکال کر خون سے لتھڑے ہوئے جسم کو دھو دھا کر صاف کیا، سامنے کے ایک باغ میں کچھ آرام لینے کے لئے پہنچایا، جہاں زخموں سے خستہ و بے جان، بھوک اور پیاس سے نڈھال، پردیسی مسافروں کی مہمان نوازی انگور کے چند خوشوں سے کی گئی، جس سے دل ٹھکانے تو کیا ہوتا لیکن صلاحیت پیدا ہوگئی کہ قدم اٹھا سکیں، لیکن قرن الثعالب [1] کے موڑ تک پہنچے تھے کہ ناتوانی نے بٹھا دیا، سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور وہی جو انکار

---

[1] یہ وہ جگہ ہے جہاں نجد کی میقات ہے اور جس کو قرن منازل بھی کہتے ہیں، اسی جگہ ایک ابر کے ٹکڑے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام نمودار ہوئے اور یہیں پہاڑوں پر مامور فرشتہ نے ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی اجازت طلب کی۔ [م-ع-ا]

کے عمل کو آخری حد پر پہنچا کر اب ردعمل کا آغاز کرنا چاہتا ہے، دس بارہ سال کی خاموش زبان میں جنبش پیدا کراتا ہے، جو بند تھی کھل گئی، طوفان امنڈ پڑا، اس وقت وہاں کون تھا جو سنتا کہ کیا ابل رہا ہے؟ تاہم غالباً زید بن حارثہؓ ہی کے ذریعے سے چند الفاظ حافظوں میں اب تک باقی ہیں، سالہا سال کے صبر و سکون کی چٹان پھوٹی، اور اس سے یہ فوارہ چھوٹنے لگا:

> ''میرے اللہ! تیرے پاس اپنی بے زوری کا شکوہ کرتا ہوں، تیرے آگے اپنے وسائل و ذرائع کی کمی کا گلہ کرتا ہوں، دیکھ! انسانوں میں میں ہلکا کیا گیا، لوگوں میں یہ میری کیسی سبکی ہو رہی ہے، اے سارے مہربانوں میں سب سے مہربان مالک! میری سن! میرا زور، میرا رب تو ہی ہے، مجھے تو کن کے سپرد کرتا ہے، جو ہم سے دور ہوتے ہیں، مجھے ان سے نزدیک کرتا ہے، یا تو نے مجھ کو میرے سارے معاملات کو دشمنوں کے قابو میں دے دیا؟ پھر بھی اگر مجھ پر تیرا غصہ نہیں ہے تو مجھے ان باتوں کی کیا پرواہ، مگر کچھ بھی ہو، میری سمائی (سما جانا) تیری عافیت ہی کی گود میں ہے، تیرے چہرے کی وہ جگمگاہٹ، جس سے اندھیریاں روشنی بن جاتی ہیں میں اسی نور کی پناہ میں آتا ہوں کہ اسی سے دنیا و آخرت کا سدھار ہے، مجھ پر تیرا غصہ بھڑکے اس سے پناہ مانگتا ہوں، مجھ پر تیرا غضب ٹوٹے اس سے تیرے سایہ میں آتا ہوں، منانا ہے، اس وقت تک منانا ہے جب تک تو راضی نہ ہو، نہ قابو ہے، نہ زور ہے، مگر علی و عظیم اللہ ہی ہے۔''

یہ چند قطرات ہیں جو اس دن کی موجوں سے محفوظ رہ گئے ہیں، ورنہ کون جانتا ہے کہ کیا کیا کہا گیا! کہلوایا گیا؟ پانچوں وقت بندہ و رب میں جب مکالمہ و مناجات کے

دروازے کھولے جاتے ہیں، جس افتتاحی کلام سے اس کا آغاز ہوتا ہے، وہ کہا جاتا ہے یا کہلوایا گیا ہے۔[1]

پس سچ وہی ہے، جسے کہتا آرہا ہوں کہ منفی قانون ختم ہو چکا تھا، طائف کی گھاٹیوں میں ختم ہو چکا تھا، اور قطعاً ختم ہو چکا تھا کہ اس کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو چکا، اندر باہر آگیا، پوری طاقت سے آیا، ہر شکل میں آیا، ہر صورت میں آیا، دے کر بھی دیکھا گیا اور پورے طور پر دیکھا گیا، لے کر بھی جانچا گیا، اور جی بھر کے جانچا گیا۔

سال دو سال نہیں، ایک جگ (ہندی زمانہ)، ایک قرن (عربی زمانہ) سے زیادہ موقعہ دیا گیا، تاکہ ٹھونکنے والے ٹھونک لیں، بجانے والے بجا لیں، کسنے والے کس[2] لیں، تانے والے تا لیں، آزمائش کی کون سی بھٹی تھی جس میں قدرت کے ہاتھوں کا پیدا کیا ہوا یہ زرِ خالص نہیں ڈالا گیا، حرارت کا کون سا درجہ ہے جو اس کی غیر معمولی لاہوتی حقیقت کو نہیں پہنچایا گیا، جو کچھ کر سکتے تھے، سب کچھ کر لیا گیا، اس کے آگے کیا کچھ اور بھی سوچا جا سکتا ہے؟ جنہیں تم نے مکی زندگی کے ان سالوں میں مسلسل تابڑ توڑ پیہم ''صدق و دیانت'' کے اس بے نظیر سرچشمہ کے ساتھ ہوتے ہوئے نہیں دیکھا، شہادتیں تام (مکمل) ہو گئیں، گواہیاں پوری ہو چکیں، تجربات مکمل طور پر مہیا ہو چکے، مشاہدات اکٹھے ہو چکے، الغرض عالم امکان میں جو کچھ ہو سکتا تھا ہو گیا، منفی قوانین اپنے سارے حقوق لے کر اپنے

---

[1] یعنی سورۂ فاتحہ جو ایک درخواست کے رنگ میں ہے، اور نمازی اسی سے نماز کو شروع کرتا ہے پھر اس درخواست کے جواب میں قرآن کا کوئی حصہ سنایا جاتا ہے، یعنی تم نے ''صراط مستقیم کی ہدایت'' کی جو درخواست کی تھی، تو قرآن تمہیں وہ سیدھی راہ بتا رہا ہے، بہر حال مقصود یہ ہے کہ حالانکہ دعا ہم کرتے ہیں لیکن اس دعا اور درخواست کی تدوین خود حق تعالیٰ نے فرمائی۔

[2] کس: سونے کو کسوٹی پر رکھ کر کھرے اور کھوٹ کی پہچان کے عمل کو کسنا کہا جاتا ہے۔ [م-ع-ا]

حدود کے آخری بالکل آخری نقطہ پر پہنچ کر ختم ہو چکے تھے۔

یقیناً وہی وقت آگیا تھا اور اب نہ آتا تو کب آتا کہ واقعات کے دوسرے رخ کا آغاز ہو۔

پس وہی جس سے ہر چیز الگ کی گئی، کائنات کا ہر ذرہ جس سے ٹکرایا اور پوری شدت سے ٹکرایا، اتنی شدت سے ٹکرایا کہ صبر و سکون کے پہاڑ، سب سے بڑے پہاڑ میں بھی جنبش پیدا ہوئی، انتظار کرو کہ اب اسی کے ساتھ ہر چیز لپٹے، جس سے سب بھاگے تھے اسی کی طرف سب دوڑیں، جس سے جدا ہوئے اسی سے سب آ کر ملیں، جس سے سب ٹوٹے اسی سے اب سب جٹیں (ملیں،) جس سے سب پھٹے اسی سے سب چمٹیں، جنہوں نے دُردُرایا (دھتکار، نکالا) وہی اب اس کو پکاریں، اور بے کسی کے ساتھ پکاریں، جس سے سب بھنچے تھے اب اسی کی طرف، ہاں! اسی کی طرف سب کھنچیں، پوری طاقت کے ساتھ کھنچیں، زمین کھنچے، آسمان کھنچے، فلک کھنچے، جن کھنچیں، اِنس کھنچیں، الغرض جو چیزیں کھنچ سکتی ہیں سب کھنچیں اور دیکھو! کیا یہی نہیں ہو رہا ہے، شاعری نہیں، واقعہ ہو رہا ہے، میں نہیں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کہہ رہے ہیں۔

جبرائیل امین کا ظہور طائف کی راہ میں

جو زمین پر چھوڑا گیا تھا اور ہر طرف سے چھوڑا گیا تھا، اسی کے مبارک قدموں سے سب کو جوڑنے کے لئے ملا اعلیٰ [1] میں جنبش ہوتی ہے، سلسلہ ملکوت (فرشتوں) کے ارتقائی (بتدریج بڑھتے) نقاط کا آخری نقطہ ''الجبرائیل الامین'' کو دکھایا گیا کہ وہ پکار رہے ہیں:

---

[1] قرآن مجید کی اصطلاح میں عالم غیب کے فوقانی (اوپر کے) طبقہ کا نام ملا اعلیٰ ہے۔

''سن لیا! دیکھو اللہ نے سن لیا، آپ کے لوگوں نے جو کچھ آپ کو کہا۔''

پھر اسی سے جس کو سب نے لوٹا یا تھا، خطاب کیا گیا:

''اور جنہوں نے آپ کو رد کیا، اور پھینکا وہ بھی اللہ سے غائب نہ تھے۔''

اس کے بعد جو ہلکا کیا گیا تھا اور جو اپنی سبکی کے دکھ سے چند منٹ پہلے کراہا تھا، "هوانی علی الناس" [1] کے ساتھ رویا تھا، دیکھو کہ اس کو وزن بخشا جاتا ہے، کیا پتھر کے باٹوں کے برابر کیا گیا؟ پہاڑوں سے تولا گیا؟ ہمالیہ، ارال، البرز، آلپس کے مساوی ٹھہرایا گیا؟ عمل کا صحیح ردعمل کیا ہوتا، اگر اسی پر بس کیا جاتا جو سب پر ہلکا تھا، جب تک سب پر بھاری نہ کیا جاتا کیسے کہا جاتا کہ عمل کا ردعمل ہو گیا۔

جبرائیل امین نے عرض کیا: "قد بعث إليك مَلك الجبال"

اللہ نے آپ کے پاس پہاڑوں کو نہیں بلکہ پہاڑوں کے فرشتہ کو بھیجا ہے۔

جس سے سب لیا گیا تھا، اب اس کو سب دیا جاتا ہے اور کس ترتیب سے دیا جاتا ہے، غیب میں بھی ملاء ادنیٰ [2] سے پہلے ملاء اعلیٰ کا وہ قدسی وجود جو روحانیوں کا سردار ہے [3] اور شاید جو دائرہ ملکوت کا نقطہ پرکار ہے، وہ دیا جاتا ہے، اس کے بعد ملاء ادنیٰ کے فرشتے ملک الجبال کی تسخیر کی بشارت سنائی جاتی ہے اور کیسی تسخیر؟ جبرائیل امین عرض کرتے ہیں:

''یہ پہاڑ کا فرشتہ ہے، آپ جو حکم دیجئے، اس کو حکم دیجئے، وہ بجا لائے گا۔''

پہاڑ کا فرشتہ حوالہ کر دیا گیا، جس کے سلام کے جواب میں بازارِ طائف کے

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا جس کا ترجمہ پیچھے درج کیا گیا ہے اسی کا یہ حصہ ہے، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی اس سبکی کی شکایت فرمائی تھی، جو اس وقت لوگوں میں آپ کی ہو رہی تھی ''لوگوں پر سبک ہونا'' اس کا ترجمہ ہے۔

[2] عالم غیب کے تحتانی (نیچے والے) طبقہ کو ملاء ادنیٰ کہتے ہیں۔

[3] یعنی جبرائیل امین، تفصیل کے لئے دیکھو میری کتاب: "الملکوت والمثال"۔

چھچھورے تک پتھر پھینکتے تھے، ردعمل کی پوری قوت کا اندازہ کرو، خود فرماتے ہیں:

''اس پہاڑ کے فرشتے نے مجھے سلام کیا''

سلام عرض کر کے جو مسخر کیا گیا تھا، فرمان طلب کرتا ہے:

"يا محمد ذالك لك"

''اے محمد ﷺ! آپ کو پورا اختیار ہے۔''

کس امر کا اختیار ہے! اُف! جنہوں نے سنگریزوں سے مارا تھا، پہاڑ کا فرشتہ اجازت طلب کرتا ہے:

''کیا ان پر (طائف کے ان پتھر مارنے والوں پر) ان دونوں پہاڑوں کو (جن سے طائف محصور-گھرا ہوا-ہے) الٹ دوں؟''

جس کو ذرائع و وسائل کی قلت کا گلہ تھا، اس کے ساز و سامان کی فراوانی کا اندازہ کرو! یہ بخاری میں کیا ہے؟ جس کے گھٹنے توڑے گئے، ٹخنے چورے (زخمی کیے) گئے، اب اس کے قابو میں کیا نہیں ہے، اور جو اختیار دیا گیا، کیا وہ پھر چھینا گیا۔

اس کے بعد اگر میں کبھی کہتا ہوں کہ اُحد میں دانت ٹوٹے نہیں بلکہ توڑوائے گئے، چہرہ مبارک زخمی ہوا نہیں بلکہ زخمی کرایا گیا، خندق میں پیٹ پر پتھر بندھے نہیں بلکہ باندھے گئے، الغرض اس کے بعد جو کچھ گزرا، میں کیا غلط کہتا ہوں، جب لوگوں سے کہتا ہوں کہ گزرے نہیں بلکہ گزارے گئے، مہینوں گھر میں آگ جلی نہیں، بلکہ نہ جلوائی گئی، کھانا پکا نہیں بلکہ نہ پکوایا گیا:

''مجھے مسکین ہی زندہ رکھ! مجھے مسکین ہی مار! اور مسکینوں ہی کے ساتھ اٹھا۔''

کیا اس آرزو کی ہر کلیجہ میں قوت ہے، کس کا جگر ہے جو یہ کہہ سکتا ہے! لیکن جن کو سب کچھ مل جاتا ہے، اپنے لئے نہیں، غیروں کے لئے سب کچھ کرتے ہیں، نعمت والے تو اپنی نعمتوں سے خوش ہیں لیکن مصیبت زدوں کی تسلی تو صرف اسی کی ذات سے ہو سکتی ہے،

جس کے پاس سب کچھ ہوسکتا تھا لیکن صرف اسی لئے کہ جن کے پاس کچھ نہیں ہے ان کے آنسو تھمیں، اس نے اپنے پاس کچھ نہیں رکھا، مؤطا امام مالک کی اس روایت کا کیا مطلب ہے کہ: ''میرے مصائب ہر مسلمان کی تعزیت کریں گے۔''

سوچنا چاہئے کہ مصیبت کی کون سی ایسی قسم ہے جو اس وجود اطہر پر نہ گزری، جو دنیا والوں کے لئے اسوہ اور نمونہ بنا کر بھیجا گیا تھا۔ [1]

ہاں! میں دور نکلا جا رہا ہوں، تو بات یہاں پہنچی تھی کہ جسے پتھر کے ٹکڑوں سے پتھرایا گیا تھا، اسی کو اختیار دیا گیا کہ وہ پہاڑوں سے اس کا جواب دے سکتا ہے اور بہ آسانی دے سکتا ہے، شاید یہ اختیار ان کو بھی نہیں جو ان پر طیاروں سے گولے گراتے ہیں، جنہوں نے ان کو پھول سے بھی نہیں مارا تھا اور نہ اتنا ان کے بس میں بھی ہے، جو ہولٹرز سے من من دو دو من کے گولے پھینکتے ہیں۔

کتنا جھوٹا غرور ہے، جن کو بم اور شل دیا گیا ہے، جب کہتے ہیں کہ ایسا کسی کو نہیں ملا، دیوانو! تم کو کیا ملا جو تم سے پہلوں کو مل چکا ہے اور جو چاہے اسے اب بھی ملتا ہے، ہمیشہ ملتا رہے گا، لیکن تم نے جو کیا اور کر رہے ہو اسے دنیا دیکھ رہی ہے، اب دیکھو! جس کو جبال ملے، ملک الجبال ملا، وہ اپنی اس قوت سے کیا کام لیتا ہے، جنہوں نے اس کو ہلکا کیا تھا، کیا ان پر ان کی زندگی کو وہ بھاری کرے گا، چاہتا تو یہ کر سکتا تھا، اور اس کو حق تھا کہ جنہوں نے اس پر

---

[1] ماں، باپ، دادا، چچا، بیوی، بچے سب آپ کے سامنے بلکہ باپ تو پیدائش سے پہلے آپ سے چھوٹے، فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سوا تمام لخت ہائے جگر کو خود اپنے ہاتھوں سپرد خاک کیا، عزیزوں کی موت کی یہ صورت ہوئی، خود آپ پر جانی و مالی مصائب جو گزرے کسی دوسرے پر اس سے زیادہ کیا گزر سکتے ہیں، آبرو عزت کی مصیبت کے لئے صاحبزادیوں کا طلاق، حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو اونٹ سے گرا کر رسوا کرنا اور واقعہ افک پر ان کی انتہا، کیا کسی امتی کو ان مصائب کے متعلق یہ خیال کرنے کا حق باقی رہ جاتا ہے کہ یہ خدا کے عتاب کا نتیجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مصائب اس کی تسلی کے لیے کافی نہیں۔

پتھراؤ کیا تھا، ان کو سنگسار کرے، اس نے طائف سے نکل کر جو کچھ کہا تھا، آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا تھا، شاید تم نے غور نہیں کیا! اس نے جو کچھ کہا تھا وہ اپنے لیے کہا تھا؟ لیکن جنہوں نے اس کے ساتھ وہ سب کچھ کیا تھا جو وہ کر سکتے تھے۔

پھر غور کرو! ان کے متعلق اس نے کچھ بھی کہا، جس قدر وہ نزدیک تھا اتنی نزدیکی جنہیں حاصل نہ تھی، جب ان کی آرزو نے نوح کا طوفان برپا کیا تو ان میں جو سب سے اونچا تھا، سمجھ سکتے ہو کہ وہ کیا کچھ نہ برپا کر سکتا تھا اور اب کس بات کی کمی تھی، جو چاہے اب وہ کر سکتا تھا، لیکن اسی تاریخ نے، جس نے نوح کے طوفان، عاد کی آندھی، ثمود کے صیحہ، شعیب کے رجفہ [1]، موسیٰ کے دریا کے واقعات کو محفوظ رکھا ہے اس نے ریکارڈ کیا کہ پہاڑ کے فرشتے سے فرمایا جا رہا ہے:

"میں مایوس نہیں ہوں کہ ان کی پشت سے ایسی نسلیں نکلیں جو
اللہ ہی کی پوجا کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک اور ساجھی نہ بنائیں"۔

پہاڑ پانی ہو گیا، اس آواز نے آگ کو باغ بنا دیا جو مر رہے تھے جی گئے، جو ختم ہو گئے تھے پھر شروع ہو گئے اور ردعمل کے سلسلہ میں جو پیش آنے والا تھا، اس کا پہلا نقش یہ تھا، خیر! یہ تو ایک ضمنی بات تھی اور جو عالمین (دونوں جہاں) کے لئے پیار لے کر آیا تھا، اس کی زندگی میں اس واقعہ کی کوئی ندرت (انوکھا پن) نہیں ہے، میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ جس سے لیا گیا تھا، جب ردعمل میں اس کو دیا جانے لگا تو کس عجیب ترتیب سے دیا گیا، شہادت و محسوس سے پہلے غیب عطا ہوا، غیب میں پہلے ملاء اعلیٰ پر قابو دیا گیا، ملاء اعلیٰ کے بعد ملاء ادنیٰ پر قبضہ کرایا گیا، اس کے بعد کیا ہونا چاہئے؟ عقل کے لئے یہ باور کرنا آسان ہے کہ غیب اور نامحسوس سے تڑپ کر یکایک یہ ترتیب محسوس اور عالم شہادت میں آجائے؟ اگر ایسا ہوگا تو

---

[1] صیحہ: چیخ، رجفہ: زلزلہ، قرآن مجید میں ان عذابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

ابھی غیب کی اور بہت سی غیر مرئی ہستیاں، ایسی ہستیاں جنہیں گو سب نہیں دیکھتے لیکن سب میں ان کے دیکھنے والے موجود ہیں، کیا وہ اس کے قابو سے باہر رہ جائیں گی جس کو سب پر قبضہ عطا کیا گیا ہے:

﴿مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ﴾

جنوں سے ملاقات اور بیعت

نہ کہا جاتا تو سوچا جاتا، سمجھا جاتا، مانا جاتا، لیکن جب کہا گیا اور صحیح روایتوں میں یقین کے ساتھ کہا گیا کہ تسخیر کا یہ سلسلہ اسی ترتیب کے ساتھ غیب سے شہادت کی طرف بڑھا اور شہادت تک تسخیری آثار اس عالم کی چیزوں سے گزر کر پہنچے، جن کو ان دونوں دنیاؤں کے درمیان برزخی واسطہ کی حیثیت حاصل ہے، تو کیا عقل بھی اسی ترتیب کو نہیں ڈھونڈتی ہے، لوگوں نے بے پروائی کے ساتھ کیوں سنا؟ جب ان کو یہی سنایا گیا، صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ ملک الجبال کے واقعہ کے بعد ہی نخلہ کے نخلستان میں اس برزخی تسخیر کا ظہور ہوا اور ٹھیک ایسے وقت میں ظہور ہوا جو رات کی تاریکی کو دن کی روشنی سے ملانے میں واسطہ اور برزخ کا کام دیتا ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ صبح کا وقت تھا، کھجوروں کے جھنڈ میں فجر کی نماز کا قرآن گونج رہا تھا عین اس وقت:

﴿صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ﴾ [الاحقاف:۲۹]

''ہم نے تیری طرف جنوں کی ایک ٹولی پھیری تاکہ وہ قرآن سنیں۔''

وہ چیخنے لگے:

﴿إِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا يَهْدِيْ إِلَى الرُّشْدِ﴾ [الجن: ۱،۲]

''ہم نے پڑھنے کی ایک عجیب چیز سنی، جو سوجھ کی راہ بتاتی ہے۔''

اور ٹھیک جس طرح کچھ نہیں ہوتا، لیکن شمع کے روشن ہونے کے ساتھ ہی بھانت

بھانت (طرح طرح) کے کتنے کچھ پروانے جو نامحسوس تھے، محسوس ہونے لگتے ہیں، یہ بھی قرآن کی روشنی پر گرے اور پروانوں ہی کی طرح قربان ہوگئے، جنوں میں آواز بلند ہوئی:

﴿اٰمَنَّا بِہٖ﴾ "ہم نے اس کو مان لیا۔"

اور قبل اس کے کہ "دیدوں" (نظر آنے والے یعنی انسانوں) کی طرح تبلیغی مہم روانہ ہو "نادیدوں" (نظر نہ آنے والے یعنی جنوں) کا یہ گروہ ان ہی نامحسوس علاقوں کی طرف تبلیغی مہم کے پہلے دستہ کی حیثیت سے روانہ ہوگیا۔

بہر حال مجھے تو اس وقت یہ دکھانا تھا کہ عمل کے بعد ردعمل کا سلسلہ کتنی اُستوار و محکم (مضبوط) ترتیب کے ساتھ آگے بڑھا ہے، نخلہ کے جنوں کا واقعہ اگر بے چارے محدثین ہم تک نہ پہنچاتے، ان کے خوف سے نہ پہنچاتے جن میں جنوں ہی کا ایک جنی ۱؎ انکار کا جنون پیدا کرتا ہے تو خیال کر سکتے ہو کہ ملاء اعلیٰ سے ملاء ادنیٰ پر آ کر ہم غیبی وجود کے اس طبقہ سے یکا یک چھلانگ مار کر شہادت اور عالم محسوس میں کس طرح چلے آتے، واقعہ نہ بھی ہوتا تو عقل کا اقتضا تھا کہ اس کو ہونا چاہئے تھا، ارتقا کی کڑیوں میں اگر کوئی کڑی نہیں بھی ملتی ہے تو ایمان لایا جاتا ہے کہ وہ ہوگی؟ بے جانے مان لیا جاتا ہے کہ وہ تھی اور ضرور تھی، پھر اگر ہم نے ان کو جان کر مانا، اور قرآن کی قطعی روشنی، حدیث کی صحیح راہ نمائی میں مانا تو دیوانوں کو اکسا کر ابلہوں (بے وقوفوں) کا گروہ ہم پر کیوں ہنساتا ہے۔

مدینہ والوں سے پہلی ملاقات

الغرض نخلہ کے نخلستان میں غیب کی آخری حد بھی ختم ہوگئی، اب شہادت و محسوس کی سرحد شروع ہوتی ہے۔

۱؎ قرآن میں "ابلیس" کے متعلق "كَانَ مِنَ الْجِنِّ" (جنوں میں سے تھا) مذکور ہے۔

مکہ معظمہ سے یہ گاؤں ایک رات کے فاصلہ پر واقع تھا، صبح ہو چکی تھی، دن نکلے مکہ کی طرف روانہ ہوئے، جس وقت مکہ کے قریب منیٰ کے میدانوں میں پہنچتے ہیں، قدرت اپنی عجیب کارفرمائیوں کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے، یہی منیٰ تھا، یہی حج کے مواسم (دِن) تھے، کتنے موسم آئے اور کتنے گئے، جب سے پھٹ کر پکارنے کا حکم ہوا تھا، اس دن سے شاید ہی کوئی موسم گزرا ہو جس میں لوگوں نے قبائل کے خیموں کے آگے:

"يا أيها الناس ! قولوا لا إله إلا الله تفلحوا"

''لوگو! بولو! اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، بامراد ہو جاؤ گے۔''

پکارنے والے کو پکارتا ہوا نہ دیکھا تھا اور جہاں یہ دیکھتے تھے، وہیں سب کے سامنے یہ بھی ہو رہا تھا کہ جس کی طرف لپکا جاتا تھا وہی بھاگا جاتا تھا، جس کو بلایا جاتا تھا وہی کتراتا جاتا تھا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس منفی عمل کا یہ حال تھا کہ جس کو جوڑا جاتا تھا وہ خود بھی ٹوٹتا اور دوسروں کو بھی پوری قوت سے توڑتا جاتا تھا، ایک بار نہیں بلکہ شاید ہر بار، جب پکار بلند ہوتی جس کا ذکر ہوا تو اسی کے ساتھ:

"يا أيها الناس ! لا تسمعوا منه فإنما يدعوكم أن تسلخوا اللات والعزىٰ من أعناقكم وحلفائكم من الجن"

''لوگو! اس کی نہ سننا، یہ تمہیں ادھر بلاتا ہے کہ لات اور عزیٰ اور ان بھوتوں کی اطاعت کا طوق اپنی گردنوں سے توڑ کر پھینک دو جو تمہارے دوست ہیں۔''

کا غوغا (شور) مچاتے ہوئے ابولہب پتھروں سے مارتا اور اتنا مارتا کہ:

"حتىٰ أدمى كعبيه"

''ٹخنے خون آلود ہو جاتے۔''

مگر یہ منفی عمل کی گھڑیوں کا تماشا تھا، اب اسی عمل کا رد مثبت شکل میں شروع

ہو چکا تھا، غیب اور اس کے سارے مدارج (رُتبے) تسخیری قوت کے آگے جھک چکے تھے اور اب محسوس وشہادت کی حد شروع ہوتی ہے، پھر دیکھو! غیب میں جس طرح سب سے پہلے وہ دیا گیا تھا جو سب سے بڑا تھا، شہادت میں بھی اس کے قدموں پر سب سے پہلے جو گرے یا گرائے جاتے ہیں ان کا تعلق جمادات ونباتات یا حیوانات سے نہیں بلکہ ان سے ہے جو ان سب میں بڑا گنا گیا۔

انصار مدینہ کی پہلی ملاقات

رات کا وقت ہے، چاند کی روشنی میں اونٹوں کے درمیان قبائل کے خیمے چمک رہے ہیں، پچھلے موسموں میں تقریباً ان میں سے ہر ایک نے جس کو دھکیلا تھا، وہی ردعمل کے ساتھ اب ان میں آتا ہے، کسی بڑے مجمع کی طرف نہیں بلکہ دس یا دس آدمیوں سے بھی کم کی ایک ٹولی پر نظر پڑتی ہے، قریب آتے ہیں، پوچھا جاتا ہے:

"من أنتم؟" (تم لوگ کون ہو؟)

ٹولی والوں میں سے ایک کہتا ہے: "من الخزرج" (خزرج قبیلہ کے لوگ ہیں)

"کیا تم بیٹھ سکتے ہو؟ تم سے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں!"

"ہاں! کیوں نہیں" جواب ملتا ہے۔

"کیا اللہ کی طرف آتے ہو؟ خدا کے سامنے جھکتے ہو؟"

دس گیارہ سال تک اسی میدان میں، اسی موسم میں، کیا کچھ نہیں کہا گیا، کیا کچھ نہیں کیا گیا، لیکن کچھ نہیں ہوا، اسی میدان میں، اسی موسم میں، اسی ہوا میں، اسی فضا میں، آج چند لمحہ میں یہ چند الفاظ زبان سے نکلتے ہیں، پھر دیکھئے، جس پر جس کے قدموں پر غیب گر چکا تھا ان ہی قدموں پر شہادت والے آج گرتے ہیں اور اس طرح گرتے ہیں کہ پھر

کبھی نہیں اٹھیں گے۔

انہوں نے باہم ایک دوسرے سے کچھ کہا، ایک لمحہ یہ تھا، اور دوسرا لمحہ یہ تھا کہ جس کو سب نے لوٹا یا تھا اس کے آگے یہی ٹولی لوٹ رہی تھی، جو کچھ کہا جا رہا تھا، دہرا رہی تھی، خدارا! بتاؤ کہ اگر یہ صرف عمل کا ردعمل نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ دس سال تک مکہ والوں نے کیوں نہیں مانا؟ اور دس منٹ بلکہ اس سے بھی کم مدت میں ان لوگوں نے کیوں مان لیا؟ کس کے بس میں ہے جو اسباب کی روشنی میں اس عقدہ (الجھن) کی گرہ کھول سکتا ہے؟ مکہ والوں میں کیا نہیں تھا جو ان میں تھا، غریب یہ تھے تو کیا وہ امیر تھے؟ باہمی خانہ جنگیوں سے یہ برباد تھے تو کیا وہ آباد تھے؟ بہر حال یہ چھ آدمی تھے، ان کا گھر وہاں تھا، جس کا زمین کے چالیس پچاس یا ساٹھ ستر کروڑ (اب ڈیڑھ ارب سے زیادہ) دلوں میں آج گھر ہے اور کیسا مضبوط اور کیسا مستحکم گھر ہے:

نوّرھا اللہ تعالیٰ وحماھا

نصرت و امداد کی آواز ان ہی کی زبانوں کی پہلی آواز تھی جو بغض و عداوت کے دہ سالہ مسلسل شور و ہنگامے کے بعد ان چھ آدمیوں کے دل سے نکلی ہے، تاریخ نے اس کو نوٹ کر لیا اور ابد تک کے لیے جریدہ عالم پر ان کا نام ''انصار'' ثبت کر دیا گیا۔

الغرض جو حرکت غیب میں پیدا ہوئی تھی، آج شہادت میں آ گئی، اب یہ بڑھے گی، چڑھے گی، چڑھتی چلی جائے گی، اس کے نیچے انسان بھی آئیں گے، حیوان بھی آئیں گے، جمادات بھی آئیں گے، الغرض وہ سب آئیں گے جو آ سکتے ہیں اور قطعاً آئیں گے، مگر جو آگے تھے وہ پیچھے ہوں اور جو پیچھے ہیں وہ آگے ہوں، ذرا اس صف کی ترتیب قائم ہونے دو، پھر دیکھنا جو کچھ دکھایا جائے اور سننا جو کچھ سنایا جائے۔

میں کہتا آ رہا ہوں کہ ماننے سے وہ گریز نہیں کرتا جس نے جان لیا، جس ہوا میں

خوشبو بس چکی ہے، اس کے سونگھنے کے بعد کیا کوئی اس خوشبو کے ماننے سے انکار کر سکتا ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ کسی میں سونگھنے کی قوت ہی نہ ہو، لیکن جس کا شامہ (سونگھنے کی حس) ماؤف نہیں ہے وہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ اس ہوا میں خوشبو نہیں ہے یا وہ بدبو ہے؟

پھر جس میں ''سچائی'' کے احساس کا حاسہ موجود ہے جب ''سچ'' کو اس کا یہ حاسہ نگل چکا، اب اس کے بعد اسی ''سچ'' کے اگلنے کی کیا صورت ہے، جو اپنے اندر بھوک کو پا چکا، کیا ممکن ہے کہ اس کے پانے کو وہ جھٹلائے، زبان سے ممکن ہے، لیکن دل سے کیسے جھٹلا سکتا ہے۔

پھر جب مکہ والوں نے جس کو دیکھا، اس وقت جس کو دیکھا، اس وقت سے دیکھا، جب وہ ان میں بے باپ کا ہوا، بے ماں کا ہوا، انہوں نے اس کو جانا، اس وقت سے جانا، جب شہر کی صبح کو بیاباں میں چوپایوں کے ساتھ گزار کر شام کرتا تھا، انہوں نے اس کا تجربہ کیا اور اس وقت سے تجربہ کیا، جب وہ اندر سے صرف امانت کی شعاعیں اور صداقت کی کرنیں ان کے اندر مسلسل جذب کر رہا تھا،[1] اس عجیب نظارہ کے وہی گواہ تھے، جب انہی کے آگے مکہ کا سب سے بڑا غریب، حجاز کا سب سے بڑا امیر کر دیا گیا، لیکن ان ہی کے سامنے اس امیر نے: ① صلہ رحمی ② حمل کل ③ کسب معدوم ④ قری ضیف ⑤ اعانت اعلیٰ

---

[1] اسی کا اتنا سخت اثر تھا کہ قیصر روم کے دربار میں آپ کے سب سے بڑے دشمن ابوسفیان سے جب آپ کی راست بازی کا حال خود قیصر نے پوچھا تو ابوسفیان کا بیان ہے کہ میں جھوٹ بولنا چاہتا تھا لیکن اس خوف سے کہ جو لوگ میرے پیچھے کھڑے ہیں مجھے جھٹلا نہ دیں، جھوٹ نہ بول سکا اور سچ کا اظہار کرنا پڑا کہ اب تک ہم میں سے کسی کو اس سے جھوٹ کا تجربہ نہیں ہے، واقعہ مفصل بخاری شریف میں ہے۔ یہ بیان اس وقت کا ہے، جس وقت قیصر کو نامہ مبارک ملا، اس سے پیشتر صفا کی پہاڑیوں پر جب منادی کی گئی اور مکہ کے تقریباً ہر خاندان والوں کو پکارا گیا، اور پوچھا گیا کہ تمہارا میرے متعلق کیا خیال ہے، تو بالاتفاق آواز آئی "ماجربنا علیك إلا صدقا" ہم لوگوں کو تمہارے متعلق سچائی کے سوا کسی اور بات کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔

نوائب الحق [1] کے بہتے ہوئے دھاروں میں سب کچھ بہا کر اپنے کو غریب کر لیا تھا اور ایسا غریب کر لیا تھا کہ:

"اس کے پاس سفر کے لئے گدھیا بھی نہیں"

کے ساتھ اس کے ہم عصر امیروں نے ٹھٹھا (مذاق) کیا، حالانکہ چاہتا تو اس گنج (خزانے) سے گنج اسی طرح گھسیٹ سکتا تھا کہ جس طرح اس کے شہر والے بلکہ گھر والے اپنی امارت سے غریبوں کی غربت میں اضافہ کر رہے تھے [2] یا دولت کے آئینہ میں بدمستیوں کا تماشا کر رہے تھے، ان سب مشاہدات کے بعد انہوں نے حراء کے دعوی کی جانچ کے لئے جو کچھ کرنا چاہا، کرتے رہے، بغیر کسی وقفہ کے دس گیارہ سال تک کرتے رہے، انہوں نے دے کر دیکھا، لے کر دیکھا، جن جن شکلوں جن جن صورتوں کے ساتھ چاہا بغیر کسی روک ٹوک کے دیکھا، رگ رگ کو الگ کر کے دیکھا، ریشہ ریشہ کو جدا کر کے دیکھا، اس نے اپنے اندر کو باہر نکال کر سب کے سامنے رکھ دیا تھا، وہ اس کو ٹٹولتے رہے، دلتے رہے، مسلتے رہے، گھستے رہے، رگڑتے رہے، مگر تجربات کی اس عریض وطویل سلسلہ کے بعد بھی ان کو، ان میں ہر ایک کو اس کے باطن میں کیا ہمیشہ وہی نہیں ملا جو وہ ظاہر کرتا تھا؟ بلاشبہ! جب اس کو دیا گیا تب بھی وہ سچ تھا اور اس سے جب لیا گیا تب بھی وہ سچ ہی تھا۔

---

[1] یہ حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا کے اس ریویو سے ماخوذ ہے، جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے کہ جب آپ غار حرا سے پہلی وحی کے بعد گھر آئے اور گھبراہٹ کا اظہار فرمایا، اس وقت آپ کی پندرہ سالہ زندگی کی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جو رپورٹ کی، اس کے الفاظ یہی تھے، "صلہ رحمی" کے معنی ظاہر ہیں، "حمل کل" کے معنی بوجھ اٹھانا یعنی یتیموں، غریبوں، بے کسوں کا بار اٹھاتے تھے، "کسب معدوم" کے معنی میں محدثین کا اختلاف ہے، میرے خیال میں اس کا ترجمہ بے کاروں کو کار کرانا، بیروزگاروں کو روزگار سے لگا دینا ہے، "قری ضیف" کے معنی مہمان نوازی، "اعانت علی نوائب الحق"، واقعی مصائب میں امداد دینا۔

[2] عرب عام طور پر سود خوری میں مبتلا تھے اور مکہ کے سود خوروں میں سب سے بڑا سود خور خود ابولہب تھا۔

یقیناً اس سے زیادہ جانچا نہیں جا سکتا جتنا انہوں نے جانچا، اس سے زیادہ جانا نہیں جا سکتا جتنا انہوں نے جانا۔

پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ جنہوں نے بعد کو مانا، اس وقت انہوں نے کیوں نہیں مانا، آدمی کے دل کی سرشت، انسانی قلب کی فطرت یہی ہے اور ہمیشہ رہے گی لیکن اسی کے ساتھ شاید اس پر غور نہیں کیا گیا جو جانتا ہے وہی مانتا ہے، پھر جس نے نہ جانا اگر اس نے نہ مانا تو اس نے کس کا انکار کیا؟ بلاشبہ ان کے دلوں نے جانا تھا، پھر اگر ان کی زبانوں نے نہ مانا تو یہ کیسے سمجھ لیا گیا کہ دلوں نے بھی نہ مانا تھا۔

کیا زبان دل ہے! یا دل زبان ہے؟ کاش ایسا ہوتا لیکن دنیا میں پھر ''جھوٹ'' کا گھونسلا کہاں بنے گا۔

''ظلم'' کے نشہ میں جب مخمور ہو ''علو'' کے مواد فاسد سے جب معمور ہو، ماننے والے دل کا جب یہ حال ہوتا ہے، تو میرا نہیں دلوں کے بنانے والے کا بیان ہے کہ اس وقت دل مانتا ہے اور زبان انکار کرتی ہے۔[1]

ان کے دلوں نے اس کو مانا تھا، مکہ والوں نے جانا تھا، انہوں نے، ان کے دلوں نے اس کو قطعاً مانا تھا، مگر جو بڑا ہے اور بڑا ہی رہے گا اور جو چھوٹا ہے، اس کے سامنے بڑا اپنی بڑائی سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔

''علو'' اور ''سربلندی'' کے اس نشہ پر ابھی کوئی ترشی نچوڑی نہیں گئی تھی، اگرچہ قریب ہے کہ نچوڑی جائے، پھر اگر بدمستی کے اس عالم میں ان کی زبانیں لڑکھڑا لڑکھڑا کر ان کے دلوں سے ٹکراتی تھیں تو پندار (غرور) کے متوالوں (نشے میں مدہوش) کو کب اس بدحالی میں نہیں پایا گیا ہے؟:

---

[1] قرآن کی آیت ہے: ﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا﴾، انہوں نے اس کا انکار کیا اور خود ان کے دل اس کو مان رہے تھے، انکار ظلم اور بڑائی کی وجہ سے کرتے تھے۔

"تنازعنا نحن و بنو عبد مناف ، أطعموا فأطعمنا ، حملوا فحملنا، أعطوا فأعطينا ، حتى إذا تحاذينا على الركب ، وكنا كفرسي دهان، قالوا منا نبي ، يأتيه الوحي من السماء ، فمتى ندرك مثل هذا ، والله لا نومن به أبدا ، و لا نصدقه".

''ہم میں اور عبد مناف کے لڑکوں میں مقابلہ ہو، انہوں نے کھلایا تو ہم نے بھی کھلایا، انہوں نے سوار کرایا تو ہم نے بھی سوار کرایا، انہوں نے دیا تو ہم نے بھی دیا، پھر جب ہم نے ان کے کندھے سے کندھا ملا لیا اور گھوڑ دوڑ کے میدان کے دو برابر گھوڑوں کے مانند ہو گئے تو اب عبد مناف والے کہتے ہیں کہ ہم میں ایک نبی ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے، بھلا ہم ایسا کہاں سے پائیں؟ قسم خدا کی ہم اس کو نہیں مان سکتے، ہم اس کی تصدیق نہیں کر سکتے۔''

دیکھو! ابو جہل کا یہ مشہور تاریخی اقرار، کیا اس کا اقرار نہیں ہے کہ اپنے جہل اور ہٹ دھرمی کی تہہ میں ''بڑائی'' اور ''علو'' کے خمار کے سوا وہ خود بھی کچھ نہیں پاتا تھا۔

اور جہاں بعضوں میں یہ تھا، کچھ ایسے بھی تھے، جن میں جاننے کے بعد اوہام و وساوس کے بھپارے (فریب، جھوٹ) اٹھ اٹھ کر ان کو ماننے سے روک لیتے تھے۔

آخر سادہ لوحوں کا وہ گروہ جن تکذیب کرنے والوں کی یہ تصدیقیں مسرت کے ساتھ سنایا کرتا ہے کہ جن کو ہم مانتے ہیں ان کے متعلق کارلائل [1] بھی یہ جانتا تھا:

---

[1] تھامس کارلائل انیسویں صدی کا مشہور برطانوی ادیب، مصنف اور فلسفی تھا، اس نے انقلاب فرانس اور دنیا کی بڑی شخصیات پر معرکۃ الآراء کتب لکھیں، اس کی ایک مشہور کتاب The Hero and Hero Worships ہے، یہ ان لیکچرز کا مجموعہ ہے جو اس نے 1840ء میں دیئے، انہی لیکچرز میں سے ایک کا عنوان The Hero as Prophet Mohammad & islam ہے، کس قدر عجیب ہے حدیث نور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق ایک منکر کے قلم سے ہو رہی ہے، سچ ہے: "والفضل ما شهدت به الاعداء" فضیلت تو وہ ہے جس کی گواہی دشمن نے دی۔ [م-ع-ا]

''وہ زندگی کا ایک جگمگاتا ہوا نور تھا جسے قدرت نے اپنے سینے سے پھاڑ کر دنیا کو روشن کرنے کے لئے چمکایا تھا، وہ جو جہاں کے پیدا کرنے والے کے حکم سے جہاں کو روشن کرنے کے لئے آیا تھا، موجودات کا عظیم راز، ہیبت ناک مگر تاب ناک راز اس کی آنکھوں کے سامنے چمک اٹھا، اس کی اپنی روح کو جو خدا کی الہامی قوت اس کے اندر موجود تھی، اس نے اس کو جواب دیا۔''

اور کوئی آرتھر نامی ڈاکٹر بھی اس کو اس قدر پہچانتا تھا:

''محمد صاحب گہرے سے گہرے معنوں میں ہر زمانے کے لئے ہر حیثیت سے سچے سے سچے زیادہ سے زیادہ صداقت رکھنے والی روحوں میں سے تھے، وہ صرف عظیم اور برتر آدمی نہ تھے بلکہ بنی نوع انسان میں جو بڑے سے بڑے یعنی سچے سے سچے آدمی کبھی پیدا ہوتے ہیں، ان میں سے ایک تھے۔''

اتنا جاننے کے بعد اتنا پہچاننے کے بعد خود ہی بتاؤ کہ انہوں نے اس کو مانا کیوں نہیں؟ جو ان کے ماننے کے لئے بھی آیا تھا، جس طرح دوسروں کے لئے اس کا ماننا ضروری تھا۔

مگر نہیں! جس قدر انہوں نے جانا تھا، اگر اسی پر قائم رہتے تو ماننے پر وہ پھر مضطر ہو جاتے، جیسا کہ ماننے والے مضطر ہوئے، لیکن وہ ''علم'' کے نشان زدہ حدود پر نہیں ٹھہرے، ''علم'' کے ساتھ انہوں نے ''وہم'' کو شریک کیا، ''وہم'' نے ان کو ''ظلم'' کے کنارے پر لا کر پھسلا دیا، دیکھو! وہ محرومی کے گڑھوں میں منہ کے بل گرے ہوئے ہیں، انہوں نے جانا مگر جاننے کے بعد ظلم کے اندھیرے نے ان بدبختوں کو ماننے سے محروم رکھا، انہوں نے وسوسہ پکایا اور بولے کیا ضرور ہے کہ جس کا ''دل'' ایسا ہے، اس کا ''دماغ'' بھی

ایسا ہی ہو!

جس کے سامنے ''مکہ'' بھی گزر چکا اور ''مکہ'' میں جو کچھ گزرا، وہ بھی گزر چکا، مدینہ بھی گذر چکا اور مدینہ میں جو کچھ گزرا وہ بھی گزر چکا، جب ان میں شک کا بخار اٹھا اور اس وقت تک اٹھ رہا ہے تو جو ابھی ''مکہ'' ہی میں تھے، مدینہ ان کی نگاہوں سے اوجھل تھا، کیوں اچنبھا ہوتا ہے اگر اوہام کی تاریکیوں میں پھنس کر انہوں نے ٹھوکر کھائی اور باوجود جاننے کے تجربات ومشاہدات کی اس تیز روشنی میں پہچاننے کے، ماننے سے وہ ہچکچاتے رہے، ان کے ''علم'' میں بھی ''ظلم'' ہی کی ''ظلمت'' (اندھیرا) شریک ہوئی اور جو چیز سامنے آچکی تھی پھر اس پر پردہ پڑ گیا۔

دارالندوہ کا آخری فیصلہ اور ہجرت

حالانکہ عمل کا ردعمل شروع ہو چکا تھا اور اس کا طوفان غیب سے سینہ تانتا ہوا شہادت کے ساحل سے ٹکرا رہا تھا، مگر انہوں نے اس کا اندازہ نہیں کیا اور جس طرح اب تک اس سے ٹکرا رہے تھے پھر ٹکرانے پر آمادہ ہوئے۔

''منیٰ'' کے میدان میں تسخیری قوت کا جو مظاہرہ ہوا تھا، اس نے ان میں اور ہلچل پیدا کی، ان کو اپنی بڑائی کی بربادی کا اندیشہ ہوا، اپنے ''ضمیر'' کے صادق احساس پر اس قسم کے اوہام کی پٹی باندھ کر وہ اندھے بنے اور کونے کے جس پھینکے ہوئے پتھر پر[1] اس لئے پہلوں نے تعجب کیا تھا کہ جس پر وہ گرتا ہے وہ بھی چور ہو جاتا ہے اور جو اس پر گرتا ہے وہ بھی چکنا چور ہو جاتا ہے، سب مل کر آخری دفعہ ٹوٹ کر گرے، جمہوریہ قریش کا مشہور

---

[1] زبور کی اس پیش گوئی کی طرف اشارہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کونہ کے سرے کا پتھر قرار دیا گیا ہے اور اس کی پیش گوئی کی گئی ہے، جو اس پر گرے گا وہ بھی چور ہوگا اور جس پر یہ گرے گا اس کو بھی چکنا چور کرے گا۔

اور منحوس ''ریزولیشن''(resolution،قرارداد) پاس ہوگیا۔[1]

کس قدر عجیب ہے، وہی جو ابو طالب کی گھاٹی میں جس کے پانی کو روک سکتے تھے، جس کے کھانے کو روک سکتے تھے کہ اس وقت ان کو اس کی اجازت تھی کی وہ ''ردعمل'' نہیں بلکہ عمل کا زمانہ تھا، لیکن آج دیکھو! ردعمل کے زور کو دیکھو کہ آج وہی کھڑے ہیں، مکہ کے ہر گھر کے سورما (بہادر) کھڑے ہیں، کھنچی ہوئی تلواریں لئے کھڑے ہیں، مکہ سے میل دو میل کسی ایسی گھاٹی کی ناکہ بندی کے لئے نہیں کھڑے ہیں کہ جس میں پہنچنے کے لئے بیسیوں راستے اور درّے ہیں بلکہ ایک مختصر سے گھر کے دروازے پر کھڑے ہیں، لیکن جس کے پانی بلکہ جس کے خادموں کے پانی اور کھانے کو متعدد راہوں والی گھاٹی میں روک سکتے تھے، آج خود اس کو روکنے پر قادر نہ ہوسکے، جاگ رہے تھے لیکن سوئے ہوئے تھے، دیکھ رہے تھے لیکن نہیں سوجھتا تھا، جس کو خاص سب کچھ دیا جاچکا تھا اسکی جان تو خیر! اب اس کے قدم کی خاک بھی اپنے ہاتھوں اپنے سر پر نہیں مل سکتے تھے جب تک وہی نہ مل دے۔[2]

سفر ہجرت کا آغاز اور اس کے واقعات

جس کے آگے ''غیب'' جھک چکا تھا، ''شہادت'' جھک چکی تھی، ''ملاء اعلیٰ وادنیٰ'' جھک چکے تھے، ''جن'' جھک چکے تھے، ''انس'' جھک چکے تھے، دل ڈھونڈتا ہے کہ اس کے آگے جمادات بھی جھکیں، نباتات بھی جھکیں، حیوانات بھی جھکیں، درند بھی جھکیں، دوند بھی

---

[1] یعنی قید وجلاوطنی کی رائے کو مسترد کرکے طے کیا گیا کہ جمہوریہ کی ہر پارٹی (قبیلہ) سے ایک آدمی اس مجمع میں شریک ہو جو اندھیرے میں ایک دفعہ مل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کام (العیاذ باللہ) تمام کردے تاکہ کسی ایک پر ذمہ داری عائد نہ ہو۔

[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بستر مبارک پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سلا کر جب گھر سے باہر نکلے تو کافروں کا جو گروہ گھر کو گھیرے ہوئے تھا ان کے سروں پر خاک ڈالتے ہوئے نکل گئے۔

جھکیں، پرند بھی جھکیں، الغرض جو بھی جھک سکتے ہیں سب جھکیں اور کیا یہ صرف عقل ہی کا تقاضا ہے، جن جن کے کان ہیں سنیں۔

"إليّ یارسول الله!" [1]

میری طرف تشریف لایئے اے اللہ کے رسول!

''حراء'' کی جمادی چٹانیں چلا رہی ہیں، ''ثور'' کا پہاڑ بھی یہی پکار رہا ہے، آخر وہی مسعود ہوا جو محروم تھا، ''حراء'' میں نہیں جہاں رہ چکے تھے، بلکہ نئے غار ''ثور'' کو یہ سعادت نصیب ہوئی اور کیا صرف یہی سنایا گیا، کیا اسی کے ساتھ یہ بھی نہیں دیکھا گیا کہ اسی غار کے دہانہ پر جس میں ملائکہ کا مسجود تھا، قدرت کا مقصود تھا، ہرے بھرے درختوں کی ڈالیاں سربسجود ہیں [2]۔ اس ''نباتاتی'' وجود کے بعد ''حیوانی'' قوتوں کو ''دوندوں'' کی شکل میں بھی، ''پرندوں'' کی شکل میں بھی محو نیاز و مصروف کار پایا گیا، جلیل اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زید بن ارقم، مغیرہ بن شعبہ، انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہم سب ہی اس کے راوی ہیں۔

اس غار میں سلیمان علیہ السلام کی چیونٹیوں کی طرح غریب مکڑیوں نے سلیمان علیہ السلام کے محبوب ''خلو محمد یم'' صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پناہ کے لئے وہ گھر پیش کیا جو تمام گھروں میں سب سے زیادہ کمزور تھا، لیکن آج دنیا کا یہی "أوھن البیوت" پُھس پُھسا (کمزور) گھر، خدا جانے کتنے سنگین قلعوں کی بنیاد قرار پایا، اس کے بعد، اس گھر کے بعد، دہلی میں، آگرہ

---

[1] قاضی عیاضؒ نے شفا میں، زرقانیؒ نے شرح مواہب میں اور سہیلیؒ نے روض میں آثار صحیحہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے۔

[2] زرقانی نے قاسم بن ثابت بن حزم کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ یہ ببول یا مدار کے درخت تھے، عنکبوت (مکڑی) اور غار پر درخت کی شاخوں کے جھکنے کا ذکر امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی مسند اور مسند بزار کی حدیثوں میں بھی ہے۔

میں، درہ دانیال میں، جنوب میں، شمال میں، یہ جو لال اور پیلے، سفید و زرد قلعے بنے اور ان شاء اللہ بنتے چلے جائیں گے، ان تمام قلعوں میں سب سے پہلا قلعہ کیا کمزور مکڑیوں کا یہی کمزور جالا نہ تھا؟ کون کہہ سکتا ہے کہ آج اگر یہ نہ ہوتا تو اس کے بعد جو کچھ ہوا، ہو سکتا تھا؟ چھوٹے کو بڑا بنانے والا، بڑوں کو چھوٹا بنانے والا ہمیشہ یہی کرتا رہا ہے، کرتا رہے گا۔

فسبحان اللہ جلّت عظمتہ!

اور کون کہہ سکتا ہے کہ جن حماموں (کبوتروں) کی حمایت دنیا کی اسلامی طاقتوں کا آج متفقہ فیصلہ ہے، حرم کعبہ کے یہ کبوتر اسی جوڑے کی نسل سے نہیں ہیں جس نے ان طاقتوں کے پیدا کرنے والے کی بھی کبھی حمایت کی تھی، جو جانتے ہیں [1] وہ یہی کہتے ہیں۔

پھر میں ان سے کیا پوچھوں جو نہیں جانتے ہیں، اور سچ یہ ہے کہ جو سب کے لئے تھا، "عالمین" کی اس رحمت کے لئے اگر سب ہو رہے ہیں، سانپ اور سانپ کے زہر [2] اس کے لب و دندان کی جنبش سے بھاگتے ہیں، زمین اس کے اشارہ کے حکم سے سراقہ کے

---

[1] علامہ زرقانیؒ محدث جلیل نے اس پر بحث کی ہے کہ "غار ثور" کے دہانہ پر کبوتر کے جس جوڑے نے انڈے دے کر ان کو سینا شروع کیا تھا، حرم کے لاکھوں کبوتر اسی جوڑے کی نسل سے ہیں۔

[2] یہ سارے واقعات سفر ہجرت میں پیش آئے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جس سوراخ کو پاؤں سے بند کیا تھا اس میں سانپ تھا، اس نے کاٹ دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لعاب دہن لگا دیا، تکلیف جاتی رہی اور اب تک صدیقی خاندانوں میں اس کا نشان پایا جاتا ہے، محدث جلیل شوق نیمویؒ نے اپنے پاؤں میں اس نشان کا دعویٰ کیا ہے، اسی طرح قریش کے اعلان کردہ انعام کے لالچ نے سراقہ بن جعشم بدو کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعاقب پر آمادہ کیا، لیکن اس کا گھوڑا تین دفعہ زمین میں دھنسا، پھر امان مانگ کر سامنے آیا، ام معبد کے خیمے میں ایک بانجھ بکری بندھی تھی، ام معبد کی اجازت سے اس کا دودھ نکالا گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پیا اور آپ کے رفقاء نے بھی، یہ سارے واقعات بخاری اور حدیث و سیر کی کتابوں میں موجود اور مشہور ہیں۔

گھوڑے کی ٹانگوں کو نگلتی ہے، ام معبد کے خیمہ کی بانجھ بکری کا تھن دودھ سے بھرتا ہے، جہاں اترنا تھا اور جہاں سے اترنے کے بعد پھر حشر ہی میں اٹھنا تھا، اس کو ایک بے زبان اونٹنی پہنچاتی ہے تو بتاؤ کہ آخر عقل اس کے سوا کیا سوچ سکتی ہے "إِنَّ اللهَ مَعَنَا" جب "اول" نے "ثانی" سے کہا[1]، اس "ثانی" سے کہا جو زندگی میں اس کا ہر بات میں "ثانی" تھا اور مرنے کے بعد بھی "ثانی" ہے تو کیا یہ واقعہ نہ تھا، صرف طفل تسلی تھی، حالانکہ جس نے کہا نہ وہ طفل تھا اور جس کو کہا گیا وہ بھی طفل نہ تھا، اللّٰھم صلّ علیه وسلّم وارض عن صاحبه.

جب وہی ہوا جس کو ہونا چاہئے تو تم مبہوت (حیران) ہوئے، پھر کیا تم چاہتے ہو کہ وہ ہو جس کو نہیں ہونا چاہئے، یا جو نہیں ہو سکتا، تم کو کسی غریب بکری اور مسکین اونٹنی پر حیرانی ہے، پھر سر پیٹو گے، کیا اپنے بال نوچو گے؟ جب اس کے قدموں پر اس کے خادموں اور ادنیٰ خادموں کی جوتیوں پر عرب نثار ہوگا، عجم نچھاور ہوگا، کسریٰ گرے گا، قیصر جھکے گا۔

اور دیکھو یہ سب تو ہو بھی چکا اور جو نہیں ہوا ہے وہ بھی ہو کر رہے گا، یہاں بھی ہوگا، وہاں بھی یہی ہوگا، جس صحیح حدیث میں ہے کہ:

"أدم ومن دونه تحت لوائی یوم القیامة" [صحاح]

"آدم اور جو آدم کے بعد ہیں سب قیامت کے دن میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔"

تو کیا اسی صحیح روایت میں یہ بھی نہیں ہے!:

---

[1] غار ثور میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب روپوش تھے اور قریش کے لوگ تلاش کرتے ہوئے غار کے منہ تک پہنچ گئے اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ گھبرا گئے اور آنکھ سے آنسو بھی نکل پڑے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا "مت گھبراؤ اللہ ہمارے ساتھ ہے" فرما کر ان کی تسلی کی، قرآن نے اس قصہ کو بجنسہ بیان کیا ہے اور اس آیت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو "ثانی اثنین" دو کا دوسرا فرمایا گیا، ان ہی واقعات کی طرف اشارہ ہے۔

"لا يبقى على وجه الأرض بيت مدر ولا وبر إلّا دخله الاسلام

بعزّ عزيز وذلّ ذليل" [مسند احمد]

''روئے زمین پر کوئی گھر یا کوئی خیمہ ایسا نہیں باقی رہے گا جس میں اسلام داخل

ہوکر نہ رہے جو عزت سے چاہے گا وہ عزیز ہوکر، جو ذلت سے چاہے گا وہ ذلیل ہوکر۔''

جس کا ذکر بلند کیا گیا ہے [1]، بلند کرنے والا اپنے اس نور کی روشنی کو پوری کرکے رہے گا، "وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ"۔

سفرِ ہجرت میں سراقہ سے گفتگو

پھر یہ نہ کہو کہ جو کچھ دیکھا گیا ہونے کے بعد ہی دیکھا گیا، حالانکہ یہی چٹیل میدان ہے جہاں دیکھنا تو کیا معنی سوچا بھی نہیں جاسکتا لیکن جو بات سوچی نہیں جاسکتی ہونے سے پہلے دیکھی گئی اور اس یقین کی روشنی میں دیکھی گئی کہ کہا جا رہا تھا، اور بغیر کسی تذبذب کے اس کو کہا جا رہا تھا، جس کا گھوڑا دھنس گیا تھا، ہنستے ہوئے امان عطا فرمانے کے بعد اس کو فرمایا جاتا ہے:

"كيف بك إذا لبست سوارى كسرى"

''سراقہ تیرا کیا حال ہوگا جب تو کسریٰ کے کنگن پہنے گا؟۔''

چکرا گیا، مدلجی (قبیلے کا نام) دہقان (کسان)، سراقہ بن جعشم چکرا کر پوچھنے لگا:

"أ كسرىٰ فارس؟"

''کیا ایران کا کسریٰ؟''۔

پھر اور کون؟:

---

[1] آیت: ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾، ہم نے تیرے ذکر کو بلند کیا، ﴿وَاللهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ﴾، اللہ اپنی روشنی کو پوری کرکے رہے گا، نہ ماننے والے چاہے جتنا بھی اسے ناپسند کریں۔

"هلك كسرىٰ فلا يكون كسرىٰ بعده ، وقيصر ليهلكن ثم لا يكون قيصر بعده"[1] [صحاح]

''کسریٰ ہلاک ہوگیا، اس کے بعد کسریٰ نہ ہوگا، پھر (کچھ دن بعد) قیصر بھی یقیناہلاک ہوگا پھراس کے بعدقیصر نہ ہوگا۔''

کے اعلان کرنے والے یتیم ابی طالب نے (سلام ہوان پر، صلوٰۃ ہوان پر) اس وقت جواب دیا جب قدید (جگہ کا نام) کے ریگستان میں قرض کی خریدی ہوئی ایک اونٹنی کے سوا اُس کے پاس کچھ نہ تھا، پھر جب ہونے کے بعد اسی واقعہ کو مدینہ کی مسجد میں اسی طرح دیکھا گیا کہ وہی تاج[2] جو سونے کی زنجیروں میں بندھا ہوا، کج کلاہ (شاہان ایران کا لقب) ایران کے سر پر لٹکتا رہتا تھا، اسی مدلجی دہقان کے سر پر رکھا ہوا ہے، جواہر نگار کمر بند اس کی کمر سے باندھا گیا ہے، زیور پہنائے گئے ہیں تو کرہ زمین کا جو سب سے بڑا بادشاہ تھا[3]، کتنی پستی کے لہجہ میں کہہ رہا تھا، سراقہ نے ہاتھ اٹھایا اور بولا:

''اللہ اکبر! اسی کے لئے ساری ستائش ہے جس نے کسریٰ

---

[1] حدیث کے الفاظ قابل غور ہیں، ایرانی حکومت کی بربادی کا فیصلہ اسی وقت کر دیا لیکن قیصر کے متعلق "هلك" نہیں بلکہ "ليهلكن" کا لفظ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی تمدن کی موت اتنی قریب نہ تھی جتنی مشرقی کی اور یہی واقعہ بھی ہوا۔

[2] کہا جاتا ہے کہ سونے اور جواہرات کے بوجھ سے کسریٰ کا تاج اس قدر وزنی ہوگیا تھا کہ سر پر رکھا نہیں جا سکتا تھا، بلکہ سر ہی کو اس میں داخل کیا جاتا تھا، تاج زنجیروں سے چھت میں لٹکا رہتا تھا۔

[3] یہ مبالغہ نہیں بلکہ واقعہ ہے، چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کی سیاسی قوتوں کا مرکز دو قوتوں میں منقسم ہو کر رہ گیا تھا، سارا مشرق کسریٰ ایران کے، اور سارا مغرب قیصر روم کے زیر اثر تھا اور یہی دونوں قوتیں باہم کش مکش کر رہی تھیں کہ اسلام ظاہر ہوا اور خلافت فاروقی میں دونوں قوتیں برباد ہوگئیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی قوت تمام عالم کی سب سے بڑی قوت ہوگئی۔

سے چھینا اور مالک بدو کے بیٹے اس سراقہ کو پہنایا، جو بنی مدلج کے گنواروں کا ایک گنوار ہے۔''

فاروق اعظم ؓ بھی اس کے ساتھ اللہ اکبر اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے جاتے تھے۔

بہر حال قریش کا آخری منصوبہ اسی خاک میں مل گیا جوان کے سروں پر پری ہوئی تھی، ''مکی'' زندگی ختم ہو گئی، اس زندگی میں جو کچھ دکھانا تھا جن باتوں کا تجربہ کرانا تھا، جس کی گواہیاں مہیا کرنی تھیں، سب کام پورا ہو گیا، بڑے سکون، انتہائی ثبات، کامل استقامت سے پورا ہوا۔

اور دیکھو کہ اس زندگی کے ختم ہونے کے ساتھ جیسا کہ میں نے کہا تھا جو آگے تھے پیچھے ہو گئے اور جو پیچھے تھے آگے ہو گئے، مدینہ ایمان سے بھر گیا حالانکہ وہاں کے لوگ بعد کو آئے۔

لیکن جن میں وہ خود آیا تھا، بخت کی کوتاہی دیکھو کہ ان میں اکثروں کو اب تک ہوش نہیں آیا کہ بڑائی کے نشہ میں متوالے (مدہوش) ہیں، کچھ شکوک کی چادر اپنے ایمانی احساس پر ڈالے ہیں، دل کے متعلق بالکل اطمینان ہے، لیکن دماغ سے ان کوتاہ نظروں کا دماغ کچھ بدگمان ہے۔

مدنی زندگی

جن کوتاہ بینوں (کم نظر) نے ''دل'' کا اقرار کیا تھا، لیکن ''دماغ'' پر ان کو اب تک شک تھا اب ان ہی تنگ نظروں کے لئے دوسری زندگی کا آغاز ہوتا ہے، جس میں ''دل'' سے زیادہ ''دماغ'' ہی کی نمائش ہوگی تاکہ وہ وہمی شوشہ بھی مٹ جائے جس کی آڑ میں جاننے کے بعد نہ جاننے کے لئے چھپنے والے چھپ رہے ہیں۔

اور دیکھو کہ دماغی تجربات بینہ کی اسی کشمکش سے وہ ترشی (کھٹاس) بھی نچوڑی جائے گی، جس سے ان خود بینوں کا نشہ پھاڑا جائے گا، پھٹ جائے گا، جن کے پاؤں ''سربلندی وعلو'' (تکبر) کے خمار (نشے) کے ہاتھوں جاننے کے بعد بھی ماننے سے اب تک ڈگمگا رہے ہیں تاکہ حجت پوری ہو:

﴿لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ﴾

''جو مرنا چاہے وہ کھلے بندوں سب کچھ دیکھ کر مرے اور جو جینا چاہے وہ بھی کھلے بندوں سب کچھ دیکھ کر جیے۔''

''مدنی زندگی'' کے شروع میں جو یہ دکھایا گیا کہ: ''ھوانی علی الناس''[1] کے فریادی کو ''الناس'' اور ''ناس'' کے ساتھ جو کچھ ہیں، سب پر اس کو وزن بخشا جا رہا ہے، یا طائف کی گلیوں میں جو رد کیا گیا تھا، سلع پہاڑ[2] کے دامن میں سب اسی پر رد کئے جا رہے

---

[1] طائفی دعا کا وہی ٹکڑا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سبکی کے متعلق فرمایا کہ اے اللہ لوگوں میں یہ میری کیسی سبکی ہو رہی ہے۔

[2] شروع میں بتایا گیا تھا کہ مدینہ کے ایک پہاڑ کا نام ہے جس کا ذکر الیسع نبی کی کتاب میں بار بار آیا ہے اور آئندہ الفاظ بھی حضرت الیسع علیہ السلام کی پیش گوئی ہجرت سے ماخوذ ہیں۔

ہیں، بھوکوں کے لئے روٹی لے کر دوڑے آتے ہیں، پیاسوں کے لئے پانی لے کر دوڑے آتے ہیں، گاتے ہیں، بجاتے ہیں، باہم ایک دوسرے کو للکارتے ہیں، ابھی ابھی جس کو جمادی چٹانیں "ھلم إلی یارسول اللہ!" کے ساتھ پکار رہی تھی، اسی کو انسانی زبانیں آگے آگے بڑھ کر ٹھیک اسی طرح "یارسول اللہ ھلم إلی القوۃ والمنعۃ"[1]

اے اللہ کے رسول! زور اور حفاظت کی طرف آیئے۔

عرض کرتے ہوئے جان حاضر کرتے ہیں تو یہ مدینہ کا نہیں بلکہ قرن الثعالب کے موڑ پر طائف سے نکلتے ہوئے جس عمل کا ردعمل ملاء اعلیٰ سے شروع ہوا تھا، یہ اسی تسخیری قوت کا ظہور ہے، جو مکہ میں بھی ظاہر ہوا، ثور میں بھی ظاہر ہوا، ثور سے باہر نکلنے کے بعد بھی ظاہر ہوا، قبا میں بھی ظاہر ہوا[2]، جہاں خالق کا جو دروازہ مخلوقات کے لئے بند تھا، صدیوں کے بعد پہلی دفعہ قبا کی مسجد بنا کر کھولا گیا تا کہ جس کسی کو جہاں کہیں زمین پر قابو بخشا جائے، پہلا کام یہی کرے اور اب مدینہ میں بھی اسی ردعمل کا ظہور ہو رہا ہے، آئندہ ہوتا رہے گا، اس کا ظہور کوفہ میں بھی ہوگا، دمشق میں بھی ہوگا، بغداد میں بھی ہوگا، غرناطہ و قرطبہ میں بھی ہوگا، قاہرہ میں بھی ہوگا، غزنی میں بھی ہوگا، دہلی میں بھی ہوگا اور کیا بتاؤں کہ کہاں کہاں ہوگا، کب تک ہوگا، بلکہ سچ یہ ہے کہ ابد تک اب تو صرف اسی کا ظہور ہے، اسی کی نمود ہے، اسی لئے "مدنی زندگی" کے اصلی عناصر یہ واقعات نہیں ہیں بلکہ یہ تو مکہ ہی کے آثار ہیں جنہیں تم اب مدینہ میں دیکھ رہے ہو، بلکہ مدنی زندگی میں تم کو وہ باتیں تلاش کرنی چاہئیں جن میں "دل" سے زیادہ "دماغ" کا، "اخلاق" سے زیادہ "عقل" کا تجربہ ہو۔

"مکہ" میں جس طرح دیکھا گیا تھا کہ اس "دل" سے بہتر کوئی دل نہیں اسی طرح

---

[1] یہ الفاظ انصار کے سردار اس وقت فرما رہے تھے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا داخلہ مدینہ منورہ میں ہو رہا تھا۔
[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مسجد قبا ہی میں بنائی تھی۔

ان باتوں کا مطالعہ ''مدینہ'' میں کرو جن کو دیکھ کر کہا جائے کہ اس ''دماغ'' سے بہتر کوئی ''دماغ'' نہیں۔

بناء مسجد وصفہ

ظاہر ہے کہ مدینہ میں سب سے پہلے کام یہ کیا گیا کہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بنائی گئی اور اس کے ساتھ صفہ کا مدرسہ بنا گیا[1]، لیکن کیا صرف مسجد بنائی گئی اور مدرسہ بنایا گیا، مسجد اور مدرسہ کون نہیں بناتا اور کہاں نہیں بنتے، پھر اس میں لڑائی کیا ہے، باوجود استطاعت وقدرت کے پختہ اینٹ اور پتھر سے نہیں بنائی گئی، بلکہ کھجور کے تنوں، شاخوں اور کچی اینٹوں سے بنائی گئی، بلاشبہ اس میں یہ نمونہ ضرور ہے کہ مسلمان جس آبادی میں پہنچیں، سب سے پہلے، وہ اپنے گھر سے بھی پہلے، وہاں خدا کی عبادت کی، مسجد کی نیو (بنیاد) کھودیں کہ مسجد ہی اسلام کی میخ (کیل) ہے، اسلامی آبادی بناتے ہوئے سب سے پہلے چاہئے کہ اس میخ کو ہر مسلمان اس جگہ گاڑ دے جہاں وہ آباد ہوتا ہے، تعمیری تکلفات کی وجہ سے دقت (مشکل) نہ ہو، اس لئے سب سے پہلی مسجد کا نمونہ وہ رکھا گیا جسے ہر شخص گاڑ سکتا ہے، ہر جگہ گاڑ سکتا ہے، آخر تعمیری سامان کے لحاظ سے جو مسجد بھی ہوگی، اس سے کیا کم ہوگی جو مسلمانوں کی سب سے پہلی مسجد تھی اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسجد مدرسہ کے ساتھ ہو، علم دین ہے، دین علم ہے، عملاً اس نمونہ سے اس کی تعلیم دی گئی۔

---

[1] صفہ کے معنی چبوترے کے ہیں، باہر کے غریب الوطن نومسلموں کے لئے ایک چبوترا بنا کر چھپر ڈال دیا گیا تھا، اس کا نام صفہ تھا، اس میں یہ لوگ قرآن اور سنت کی تعلیم حاصل کرتے تھے، کھانے پینے کا بندوبست عام ارباب خیر اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے طلبہ کی تعداد سو تک بھی پہنچ گئی تھی، افسوس کہ مسلمانوں نے مسلمان طلبہ کے لئے مدرسے تو بہت بنائے لیکن نومسلموں کے لئے صفہ کی سنت ترک کردی، کاش! اب بھی لوگوں کو یہ خیال ہو۔

تحویل قبلہ کا راز

میں نہیں کہتا کہ اس مسجد و مدرسہ کے بنانے میں یہ مصالح بھی پیش نظر نہیں تھے، یا آئندہ مسلمانوں کو اس نمونہ کے پیچھے نہیں چلنا چاہیے۔ لیکن دیکھا گیا پر سوچا نہیں گیا، آخر مسجد عرب میں بنتی ہے، عرب میں کعبہ موجود تھا جو صرف عرب جاہلیت ہی میں نہیں بلکہ اسلام میں بھی محترم تھا، لیکن با ایں ہمہ (اس سب کے ساتھ) اس مسجد کا قبلہ عرب سے باہر فلسطین کے سلیمانی ہیکل کو کیوں ٹھہرایا جاتا ہے۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ صرف قبلہ مقرر ہوا لیکن یہ کسی نے نہیں دیکھا کہ وطنیت کا جو بت عرب میں صدیوں سے پوجا جاتا تھا، اور اس زور شور سے پوجا جاتا تھا کہ اس بت کا پجاری اپنے سوا سب کو "عجم" اور "گونگا" سمجھتا تھا، دیکھو کہ صرف ایک اسی مخفی ضرب نے اس بت کو پاش پاش کر دیا۔

جب قرآن میں ہے کہ ابتداءً عربوں پر غیر ملکی قبلہ گراں گزرا[1]، یہی تو غور کرنا تھا کہ کیوں گراں گزرا؟ لیکن اب تو گرانیوں کے برداشت کا انہوں نے عہد کیا تھا، جھجکے، مگر اسی کے ساتھ ہی آگے بھی بڑھ گئے اور حولادا (اٹھوایا) گیا، لاد (اٹھا) لیا، سترہ مہینہ تک اس وطنیت شکنی کی مشق نے جب ان کے لئے عرب اور غیر عرب کو ایک بنا دیا تو اس سے بھی عجیب اور عجیب تر تماشا پیش ہوتا ہے۔

بیت المقدس کو قبلہ بنا کر عرب کے باشندے عرب سے الگ کئے گئے، لیکن اب عرب ہی نہیں بلکہ عرب اور غیر عرب، خدا کی ساری زمین سے یہ عرب اور غیر عرب کا قصہ ہی ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جاتا ہے، سترہ مہینہ کے بعد قبلہ بدلتا ہے اور بجائے سلیمان کی

---

[1] ﴿وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ﴾ یعنی "قبلہ کی تبدیلی گراں گزری مگر ان پر نہیں جنہیں اللہ راہ دکھا چکا تھا" کی طرف اشارہ ہے۔

ہیکل کے سلیمان وداؤد، اسحاق واسماعیل علیہم السلام کے باپ ابراہیم علیہ السلام کے بنائے ہوئے کعبہ کو قبلہ ٹھہرا کر حکم دیا جاتا ہے:

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَه﴾

''اور جہاں سے تم نکلو اسی جگہ سے تم اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف موڑ دو، اور جہاں کہیں (اے مسلمانوں) تم ہو اپنے چہروں کو اس کی طرف موڑ دو۔''

کیا مقصد ہے اس کا؟ یہی کہ جو کعبہ سے باہر کئے گئے ہیں وہ بھی کعبہ کے اندر ہیں اور جو کعبہ سے باہر تھے اپنے کو کعبہ کے اندر سمجھیں، پہلے غیر عرب کو عرب کا قبلہ بنایا گیا اور جب یہ ہو چکا تو پھر عرب اور غیر عرب سب کو مٹا کر نہ عرب ہی رہا نہ غیر عرب رہا، بلکہ خدا کی جو ایک دنیا تھی وہ ایک ہی دنیا کی شکل میں واپس آگئی، کعبہ دنیا کی مسجد کی دیوار ٹھہرایا گیا اور بسیط (پھیلی ہوئی وسیع) زمین اسی دیوار کا صحن قرار پائی، یہی ہر مسلمان سمجھتا ہے اور اسی کے مطابق عمل کرتا ہے، وہ افریقہ کو بھی کعبہ میں سمجھتا ہے اور امریکہ کو بھی اس کے صحن کا ایک حصہ قرار دیتا ہے، ایشیا بھی اس کو کعبہ کی دیواروں کے نیچے نظر آتا ہے، یورپ میں بھی جب اس کو نماز کی ضرورت ہوتی ہے تو کعبہ کے آنگن میں کھڑا ہو کر وہ اپنی نماز ادا کرتا ہے، ہمالیہ کی سب سے بڑی چوٹی ''ایورسٹ'' اسی کے صحن کا ایک ٹیلہ ہے اور بحر محیط اسی صحن کا ایک حوض، بحر قلزم اسی صحن کی ایک نالی ہے، ایک مسلمان اپنی زندگی کے ہر دن میں پانچ وقت اسی نظریہ کی عملی شکل میں مشق کرتا ہے اور اس کو یہی بتایا گیا ہے، صحیح حدیث میں ہے:

''جعلت لی الارض مسجدا''

''پوری زمین میری مسجد بنائی گئی ہے۔''

مواخاۃ اور اس کا فائدہ

وطنیت' کے اس صنم اکبر کو توڑنے کے ساتھ اب ''قومیت'' (قوم پرستی) اور ''نسبت'' (نسل پرستی) کا بت سامنے آتا ہے، کس قدر سرسری طور سے لوگ گزر جاتے ہیں جب سنتے ہیں یا کہتے ہیں کہ ''مدینہ'' میں انصار اور مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ کرایا گیا تھا، ان میں عقد مواخاۃ (بھائی چارگی کا معاہدہ) قائم کیا گیا تھا، لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا، مہاجرین قریش اور قریشی نسل کے ساہوکار (سودخور) کعبہ کے کلید بردار تھے اور انصار قبیلہ اوس وخزرج کے کسان اور کاشتکار تھے، حالانکہ دونوں آدمی تھے، دونوں انسان تھے، لیکن جس طرح آریائی نسل [1] والوں نے سامی [2] نسلوں کو اور سامی نسلوں نے تورانی نسلوں [3] کو یا برہمنوں (ہندوؤں کی سب سے اونچی ذات) نے شودروں (ہندوؤں کی

---

[1] سنسکرت زبان میں آریہ کے معنی بزرگ اور معزز کے ہیں، یہ اُس قوم کا نام ہے جو تقریباً اڑھائی ہزار سال قبل مسیح وسط ایشیا سے چراگاہوں کی تلاش میں نکلی اور ایران کو پامال کرتی ہوئی برصغیر پاک و ہند میں وارد ہوئی اور یہاں کے قدیم مہذب قوموں دراوڑ کو جنوب کی طرف دھکیل کر خود ملک پر قبضہ کرلیا، آریاؤں کے کچھ قبیلوں نے یورپ کا رخ کیا اور وہاں جاکر آباد ہوگئے، آریہ سفید رنگ، دراز قد اور بہادر تھے، فکر کی بلندی اور تنظیم کی صفات ان میں موجود تھیں۔ [م-ع-ا]

[2] عراق، شام، کنعان، فلسطین، فونیشیا شمالی افریقہ اور جزیرہ نمائے عرب میں جو عرب اقوام ہیں، وہ تمام سامی الاصل ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہ تمام قومیں حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے سام بن نوح کی اولاد ہیں، اس لیے سامی کہلاتی ہیں، ان ملکوں کی مختلف زبانوں (موجودہ قدیم دونوں) کو سامی زبانیں کہتے ہیں، آج کل سامی زبانوں میں عبرانی، اشوری اور عربی زندہ ہیں جن میں عربی سرفہرست ہے۔ [م-ع-ا]

[3] وسط ایشیا کے اس علاقے کو توران کہتے ہیں جس میں ترک، تاتاری، ترکمان وغیرہ نسل کے لوگ آباد ہیں، یہ علاقہ ایک طرف منگولیا تک پھیلتا چلا گیا ہے، اور دوسری طرف روسی قفقاز تک کے علاقے کو اپنی مغربی سمت کے پھیلاؤ میں لیے ہوئے ہے، یہ وہی علاقہ ہے جس پر کبھی شاہنامہ فردوسی کا تورانی فرمانروا افراسیاب حکمران تھا اور جس کی برپا کی ہوئی جنگوں میں ایران کا مشہور پہلوان رستم بن زال معرکہ آرا نظر آتا تھا، آج کل یہ علاقہ قلمرو چین اور وسط ایشیا کے ممالک میں بٹا ہوا ہے اور اس کے سنکیانگ، ترکستان، ازبکستان، ترکمانستان، قازقستان، آذربائجان وغیرہ کے ناموں کے ساتھ کئی حصے بکھرے ہوگئے ہیں۔ [م-ع-ا]

سب سے نچلی ذات) کو، بے رنگوں نے رنگینوں کو، پھیکوں نے نمکینوں کو، آدمی کی نہیں بلکہ گھوڑوں کی اولاد، بیل کی نسل سمجھا اور اسی قسم بلکہ ان سے بدتر سلوک انہوں نے ان لوگوں کے ساتھ روا رکھا جو ان کے ہم نسل ہم قوم نہ تھے۔

قریش کو اپنے نسب پر، اپنے حسب پر بڑا ناز تھا، نسبی فخر ایک دیوتا تھا جو صدیوں سے ان میں پوجا جاتا تھا اور اس طرح پوجا جاتا تھا کہ غیر قریش عربوں کے ساتھ حج کرنے میں بھی اپنی اہانت محسوس کرتے تھے، جس طرح آج بھی اُجلے کالوں کے ساتھ دعا تک مانگنے میں اپنی ذلت سے ڈرتے ہیں، قریشی اس قبرستان میں بھی دفن ہونا ننگ خیال کرتے ہیں، جس میں غیر قریشی دفن ہوتا، جس طرح آج بھی شودروں کی مسان (مردے جلانے کی جگہ)، برہمنوں چھتریوں [1] کے مرگھٹ (مردے جلانے کی جگہ) سے دور ہوتی ہے، یہی مواخاۃ کا گرز (سلاخ نما لوہے کا ہتھیار) تھا جس نے اس بت کو بھی ڈھیر کر کے رکھ دیا۔

قریشی سردار انصاری کسان کے آگے جھکا ہوا تھا، وہ اس کے ہاتھ چومتا تھا اور یہ ان کے قدم لیتا تھا، یہ اس کو اپنا سب کچھ بلکہ تم نے سنا ہوگا کہ طلاق دے کر ایک بیوی تک دینے پر اصرار کرتا تھا اور وہ شکریہ کے ساتھ انکار کرتا تھا۔

اور یوں مخلوقات بلکہ اپنے خودساختہ مخلوقات کے پنجوں سے آزاد ہو کر مدینہ والوں نے اپنے کھوئے ہوئے رب قیوم کو پالیا تھا، اس کے بعد منادی کرادی گئی کہ اب دنیا ایک ہے، اس کا معبود ایک ہے، ان کا رسول ایک ہے، ان کی کتاب ایک ہے، ان کا کعبہ ایک ہے۔

---

[1] تقریباً پانچ سو سال قبل مسیح سے طبقاتی نظام ہندو آریائی معاشرہ کی نمایاں خصوصیات میں سے شمار کیا جانے لگا اور پورے ہندو معاشرہ کو چار طبقوں (ذات) میں تقسیم کر دیا گیا:

① برہمن: (مذہبی پنڈتوں کا طبقہ) ② چھتری: (اشراف وامراء کا طبقہ)
③ ویش: (کاروباری طبقہ) ④ شودر: (خدمت گزار و نوکر طبقہ)

[م-ع-ا]

اذان کی ابتدا

اور دیکھو کہ دن کے پانچ وقتوں میں کڑک کڑک کر گرج گرج کر بلند میناروں سے پکارنے والے مشرق میں، مغرب میں، زمین کے آخری کناروں تک یہی پکار رہے ہیں، پکارتے رہیں گے، کیا ناقوس [1] سے، بوق (بگل) سے، قرنا (بگل) [2] سے، گھنٹوں سے، طبل (بڑا ڈھول) سے، نقاروں (ڈھول) سے یہ بات ممکن تھی جس کی ابتداء اذان کے عجیب وغریب ندائی طریقہ سے اسی کے بعد زمین پر اسلام کی سب سے پہلی مسجد میں کی گئی، [3] متعدد وطنوں کا بت ٹوٹ گیا، متعدد نسلوں کا صنم چور چور ہو گیا۔

جو توڑے گئے تھے جٹ (مل) گئے، جو بکھیرے گئے تھے سمٹ گئے، الغرض جو ایک تھے وہ ایک ہی ہو گئے اور اسی یکتائی کا خلاصہ یہ ہے جس کا اعلان اذان کی شکل میں پانچوں وقت کیا جاتا ہے، محض فکر و خیال میں نہیں، بلکہ واقع میں عملی طور پر مدینہ میں دنیا کا یہ نقشہ قائم ہو گیا۔

---

[1] وہ سنکھ جو ہندو اپنی پوجا پاٹ کے وقت بجاتے ہیں یہ ایک قسم کے سمندری جانور کا گھر ہوتا ہے۔

[2] ''بوق وقرنا'' مترادف ہیں ایک قسم کا باجا بجانے کا سینگ نما بگل، جسے بگل کی پھونک سے بجاتے ہیں، قدیم ایام میں شاہی جلوس یا اعلان جنگ وغیرہ کے موقع پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا۔ [م-ع-ا]

[3] جب مسلمانوں نے مسجد نبوی کی تعمیر کر لی تو یہ سوال زیادہ محسوس ہونے لگا کہ کس طرح مسلمان وقت پر نماز کے لئے جمع ہوا کریں، حضور ﷺ کے مشورہ طلب کرنے پر کسی نے ناقوس کی رائے دی، کسی نے بوق (بگل) کی تجویز پیش کی، کسی نے آگ جلانے کا مشورہ دیا، اسی طرح بعض اور تجاویز بھی سامنے آئیں، اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ کسی آدمی کو مقرر کیا جائے جو نماز کے وقت اعلان کر دیا کرے، آنحضرت ﷺ نے اس رائے کو پسند فرمایا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ اس فرض کو ادا کیا کریں، اس کے بعد جب نماز کا وقت ہوتا ''الصلوة جامعة'' کہہ کر پکارا کرتے اور لوگ مسجد نبوی میں جمع ہو جایا کرتے، کچھ عرصہ کے بعد ایک صحابی عبداللہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ کو خواب میں موجودہ اذان کے الفاظ سکھائے گئے۔ [م-ع-ا]

تبلیغِ عـام کا آغاز

انسانیت کی آزادی کا یہی عالمگیر نقشہ تھا، جس کو عالم پر منطبق کرنے کے لئے "کافة للناس" [1] کا "بشیر ونذیر" اب "کافة الناس" کی طرف بڑھتا ہے، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

اس کو اختیار تھا کہ قرن الثعالب کے پاس اس کو جو اخشبین (دو پہاڑ) دیئے گئے تھے، ان ہی کو لے کر آگے بڑھتا ہے، لیکن یہ تو پھر "دل" کا امتحان ہو جاتا، حالانکہ اب تو صرف "دماغ" ہی کا تجربہ کرانا مقصود ہے، دکھایا جاتا ہے کہ جس کے دماغ کے یہ کارنامے ہیں اس کو مجنون کہنے والے کیا خود مجنوں نہیں ہیں، جس کی عقل، جسم کے فہم کے یہ کرشمے ہیں، اس کے عقلی توازن میں نقص نکالنے والے ایسے بدبخت کیا خود عقلی توازن سے محروم نہیں ہیں۔

مشکلاتِ راہ

راستہ اگر صاف ہوتا تو اس وقت جو کچھ دکھانا ہے، کامل طور پر دکھایا نہیں جا سکتا تھا، لیکن دیکھو! راہ میں کانٹوں کے جو گھنے جنگل چپ وراست (دائیں، بائیں) اوپر نیچے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں وہ قصداً ان ہی میں گھس کر نکلتا ہے اور کتنے شاندار طریقہ سے نکلتا ہے۔

بیابان کے ایک نخلستانی قصبہ کے ان کسانوں کی آبادی سے یہ تحریک عالم کی طرف یلغار کرتی ہے جو یہودی ساہوکاروں کے سود در سود کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں، ان کی زمینوں میں پیدا ہی کیا ہوتا ہے۔

لیکن جو کچھ بھی پیدا ہوتا ہے، پیدا ہوتے کے ساتھ یہودی قرض خواہوں کے گھر

---

[1] یعنی سارے انسانوں کو خوش خبری اور دھمکی دینے والا، قرآن کی آیت کا اقتباس جس میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ہم نے تم کو سارے انسانوں کا بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے۔

اٹھ کر چلا جاتا ہے، زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ اس چھوٹی سی آبادی کے دو خاندان اپنی خانہ جنگی میں رہے سہے جوانوں اور سرداروں کو بھی کھو چکے ہیں، ان کے ساتھ اپنے دَھن (مال ودولت) سے، وطن سے، بچھڑے ہوئے کچھ لوگ اور بھی شریک ہیں، جن کی تعداد سو سے زیادہ نہیں ہے ان کا یہ حال ہے، دوسری طرف سارا عرب ایک کمان بن کر اس تحریک کو اور تحریک والوں کو نشانہ بنائے ہوئے ہمیشہ کے لئے نیست ونابود (ختم) کرنے پر تلا ہوا ہے، یہودی اپنی مہاجنی (سودی تجارت) کی کساد بازاری (بازار میں خرید وفروخت کے نہ ہونے) سے گھبرا کر ان تمام قلعوں اور قلعہ والوں کو مخالفت کے نقطہ پر جمع کر رہے ہیں جن کا سلسلہ مدینہ سے شروع ہو کر شام کی حدود تک پھیلا ہوا ہے، مشکلات کا خاتمہ اسی پر نہیں ہوجاتا ہے، بلکہ بتدریج مخالفت کی یہ آگ بڑھتے بڑھتے اس وقت کی دنیا کی سب سے بڑی مشرقی طاقت (ایران) اور سب سے بڑی مغربی قوت (روم) دونوں طاقتوں کو مدینہ کی بربادی پر آمادہ کر دیتی ہے۔

رومیوں کے گھوڑے مدینہ سے تھوڑی دور کے فاصلہ پر غسانیوں [1] کے حدود پر ہنہنا رہے ہیں اور کسریٰ [2] کے چپراسی وارنٹ لئے مدینہ پہنچ کر دھمکا رہے ہیں کہ:

> ”مدینہ کے کسانوں کے سردار کو دربار شاہی میں گرفتار کر کے حاضر کیا جائے۔“

---

[1] مدینہ منورہ کی شمالی حدود پر عیسائی راجواڑے رومی حکومت کے باج گزار تھے، اور ان ہی کے ذریعہ سے اسلام کو رومیوں سے تعلق پیدا ہوتا تھا، اسی حکومت کا بادشاہ جبلہ مسلمان ہو کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مرتد ہو کر قسطنطنیہ بھاگ گیا تھا، رومیوں سے چھیڑ چھاڑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں شروع ہوگئی، موتہ میں گھمسان کی جنگ بھی ہوئی اور تبوک کا سفر رومیوں ہی کو روکنے کے لئے تھا، لیکن ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔

[2] جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک کسریٰ شاہ ایران کے پاس اس طرح پہنچا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک اس کا نام سے پہلے تھا، تو علاوہ خط پھاڑنے کے اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گرفتاری کے لئے چپراسی مدینہ بھیجے۔

یہ ان کے شہنشاہ کا فرمان ہے جو یمن کے گورنر باذان کے توسط سے مدینہ تک پہنچا ہے، یہ اس وقت کا سماں ہے، جس وقت مدینہ میں ''دماغ'' کے تجربہ کے لئے نسل انسانی کو دعوت دی جاتی ہے، پھر کیا ہوتا ہے۔

غزوہ بدر

قیدار[1] کی ساری حشمت جیسا کہ یسعیاہ نبی نے کہا تھا، ایک سال ٹھیک مزدوروں کے ایک سال کے اندر بھس کی طرح جل کر راکھ ہو جاتی ہے، علو و کبریائی کا جو نشہ ان کے قدم کو جمنے نہیں دیتا تھا، پھٹ کر ہوا ہو گیا، جو سب سے بڑا تھا[2]، سب سے چھوٹے کے ہاتھوں قتل ہوا، قریش کے ستر سورما (بہادر) مارے گئے اور یوں قیدار کی حشمت خاک میں مل گئی۔

وہی عرب جو ایک کمان سے تیر بن کر[3] اس کونے کے پتھر پر گرے تھے جیسا کہ کہا گیا تھا، جو اس پر گرتا ہے چور چور ہو جاتا ہے، چور چور ہو کر اس طرح بدلے کہ جو دشمن تھے وہ دوست ہو گئے۔ جن پر تلوار چلائی گئی وہ نہیں، بلکہ جنہوں نے تلوار چلائی، انہوں نے مسلمان ہو کر ان جھوٹوں کو جھٹلایا، جنہوں نے بازاروں میں پھیلایا تھا کہ جو کچھ پھیلایا گیا تلوار کے زور سے پھیلایا گیا، مکہ میں جن سے چھینا گیا تھا، سب کچھ چھینا گیا، پانی چھینا گیا،

---

[1] حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹوں میں سے ایک بیٹے کا نام قیدار تھا، جن کی نسل سے قریش تھے اسی لئے بائبل میں ان کا ذکر قیدار کے لفظ سے کیا جاتا ہے۔

[2] ابو جہل جس کا دوسرا خطاب ''فرعون هذه الامة'' یعنی اس امت کا فرعون تھا، ایک کم سن انصاری لڑکے کی تلوار سے قتل ہوا، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جب اس کا سر کاٹنا چاہا تو اس کا یہ مشہور فقرہ تاریخ میں محفوظ ہو گیا: ''سردار کی گردن ہے ذرا نیچے سے تراشنا تا کہ مقتولوں کی صف میں جب میرا سر رکھا جائے تو اونچا نظر آئے۔''

[3] عربی تاریخوں کے اس جملہ کا ترجمہ ''رمھم بقوس واحد'' یعنی عربوں نے مسلمانوں پر ایک کمان بن کر تیر برسانا شروع کیا۔

کھانا چھینا گیا، گھر چھینا گیا، در چھینا گیا، اور آخر میں جینے کا حق بھی چاہا گیا تھا کہ چھینا جائے، اور کتنوں سے چھینا گیا، دہکتی ہوئی آگ، چمکتی ہوئی تلواروں، کھنچی ہوئی کمانوں کے نیچے سے بھاگے ہوئے، پھر چمکتی ہوئی تلواروں اور کھنچی ہوئی کمانوں، تنے ہوئے نیزوں کے ساتھ فتح کا پھریرا (جھنڈا) اڑاتے ہوئے مکہ میں داخل ہوتے ہیں لیکن لیتے ہوئے نہیں، دیتے ہوئے، اکڑے ہوئے نہیں، جھکے ہوئے، بدلہ چکاتے ہوئے نہیں، حط وعفو کرتے ہوئے:

﴿اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ﴾[1]

"شہر کے دروازے میں سر جھکائے ہوئے اور حطہ (یعنی گناہوں اور قصوروں کو جھاڑتے ہوئے، معاف کرتے ہوئے) داخل ہونا۔"

کی تعمیل کرتے ہوئے، رحم وکرم، صفح واعراض، مغفرت ودرگزر، امن وامان کے پھول برساتے ہوئے:

"الیوم یوم بروو فاء الیوم انتم الطلقاء"

"آج صلہ رحمی اور وفا کرنے کا دن ہے، آج تم لوگ آزاد کئے گئے۔"

کے موتی نچھاور کرتے ہوئے زمین پر انسانوں کے لئے جو پہلا گھر، مخلوق کی نہیں بلکہ خالق کی، صرف خالق کی عبادت کے لئے بنایا گیا تھا اس میں:

"لا الٰه الا الله ، الحمد لله وحده ، نصر عبده ، و هزم الأحزاب وحده"

---

[1] یہ قصص بنی اسرائیل کا ایک حصہ ہے جس میں اسرائیلیوں کو ایک قریہ میں "سجداً وحطة" کہتے ہوئے داخل ہونے کے لئے کہا گیا تھا، مفسرین نے اس کے جو معنی لئے مجھے اس سے انکار نہیں ہے لیکن خلقہ قرآن کے حساب سے کیا یہ تفسیر بہتر نہیں ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کر کے دکھایا، واقعی عبادت کے لائق اللہ کے سوا نہیں، اسی کی ستائش ہے، صرف اسی کی جس نے اکیلے (بغیر لڑے بھڑے) اپنے بندے کی مدد کی۔

کہتے ہوئے سربسجود ہو گئے، ابراہیم کا بیت ایل (کعبہ) پتھر کی کھودی ہوئی مورتیوں کی گندگی سے پاک ہو گیا۔

عہد نبوت کے جہاد میں شہداء اور مقتولوں کی ایک ہزار اٹھارہ تعداد[1]

اور حیرت ہے کہ بکھرا ہوا وحشی عرب جس میں وثنی، بت پرست، یہودی، عیسائی، صابی (ستارہ پرست)، عقل پرست سبھی ہیں، ان مختلف اقوام وقبائل کے باہمی انتشار جنگ وجدال (لڑائی) کو ختم کر کے ایک پرامن آئینی نظام سلطنت کے ساتھ وابستہ کرنے میں جھوٹوں نے جس قدر بھی جھوٹ چاہا پھیلایا، لیکن واقعہ صرف اس قدر اور اسی قدر ہے کہ دس لاکھ مربع میل کی طویل وعریض سرزمین کا پایہ تخت جس وقت کسانوں کا وہی قصبہ ہو گیا تو دس سال کی اس لمبی اور دراز مدت میں وثنیوں (بت پرستوں) یہودیوں، عیسائیوں، مسلمانوں، سب میں سے امن وامان کی اس جدوجہد میں طرفین کے جتنے آدمی کام آئے، ان کی تعداد کروڑ، لاکھ بلکہ دو ہزار چار ہزار بھی نہیں، اتنی بھی نہیں جتنے ''نیویارک'' کی سڑکوں یا لندن کی شاہراہوں پر موٹروں کے نیچے سے روزانہ اٹھائے جاتے ہیں، یا ہندوستان کی معمولی جھڑپوں میں لاشوں کی جو فہرست تیار ہوتی ہے، بلکہ کل لے دے کے سب کی کل تعداد ایک ہزار اٹھارہ ہے، یہ ہے خونی پیغمبر کا بہایا ہوا خون، یا قصابوں کی وہ ''دکان'' جس کے شور سے گنبدِ گرداں (آسمان) بھی تھرا اٹھا ہے، غیر تو غیر اپنے بھی پریشان ہیں۔

---

[1] عہد نبوی کے شہداء ومقتولین اور جنگ عظیم کے مقتولین کے اعداد وشمار کا تقابلی جائزہ کتاب کے آخر میں ضمیمہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

اُف! برکندہ باد (باہر نکلی ہوئی خراب) آنکھوں سے بد اندیشوں کو صرف وہیں خون نظر آیا جہاں سے انسانیت کی مردہ لاش میں زندگی کا خون دوڑایا گیا، جہاں موت ہے مُردوں کو، دل کے مُردوں کو وہاں زندگی نظر آرہی ہے، اور جہاں سے صرف زندگی بٹ بنٹ رہی ہے، انصاف کرنے والوں نے کیسا انصاف کیا، کہ موت کی وادی کے نام سے انہوں نے دنیا میں اس کا پروپیگنڈہ کیا، ایک ہزار اٹھارہ تعداد تو اس وقت ہے جب اس میں بلاوجہ بنی قریظہ [1] کے ان یہودیوں کو بھی شریک کرلیا جائے، جن کو خود ان کی کتاب اور ان کی شریعت نے ان ہی کی مرضی سے اپنے ہی قانون کی رو سے اس وقت ناپید کیا جب سمجھا گیا کہ اس چھوٹی سی جماعت کی زندگی سے سارے عرب بلکہ ممکن ہے کہ عرب کے اطراف کی بڑی جماعت کی موت پیدا ہوگی، آخر جب کروڑوں مقتولوں والی عالمگیر جنگ کی آگ یہودی [2] پھونک کی سلگائی ہوئی مانی جاتی ہے، تو اگر ان ہی یہودیوں کے متعلق یہ سمجھا گیا تو کیا غلط سمجھا گیا اور صرف یہی نہیں، اسی ایک ہزار اٹھارہ میں بے چارے ان شہید معلّموں کو بھی شمار کرلیا گیا ہے جن کو نجد والے اپنے ملک میں وعظ و تلقین، تعلیم و تذکیر کے لئے لے گئے اور معونہ نامی کنوئیں پر ستر آدمیوں کو شہید کردیا، ان ہی میں وہ دس مبلغ بھی ہیں، جنہیں

---

[1] خندق کی جنگ میں یہودیوں کے مال، روپے اور قریش کے آدمیوں نے مل کر مدینہ کو بیس ہزار فوج سے گھیر لیا، بنی قریظہ کے یہودیوں سے مسلمانوں کا معاہدہ تھا کہ جنگ میں باہم ایک دوسرے کی مدد کریں گے لیکن اس بے کسی کے وقت جب ان سے مدد مانگی گئی تو ان یہودیوں نے کہا کہ ہم محمد کو نہیں جانتے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت تو چھوڑ دیا، جب خدا کی آندھی نے عرب کی اس آندھی کو شکست دی، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنی قریظہ کے محاصرہ کا حکم ہوا، آخر میں بنی قریظہ والوں نے سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو حکم بنا کر قلعہ کھول دیا، انہوں نے ان کے جوانوں کے قتل کا فیصلہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کتاب کے مطابق فیصلہ ہے، کیونکہ اہل کتاب کی کتاب میں عہد شکنی کی سزا یہی تھی۔

[2] یورپ کی گزشتہ عالمگیر جنگ کے متعلق تحقیق نے بالآخر یہ ثابت کیا کہ اس کی تہہ میں امریکہ اور یورپ کے یہودی ساہوکاروں کا ہاتھ تھا۔

بے دردی کے ساتھ بلاوجہ ''رجیع'' ؎ کے مقام پر ذبح کر دیا گیا، یہ تو مسلمانوں کی طرف کے شہداء ہوئے، اسی طرح فریق ثانی کے مقتولوں کو اسی تعداد میں شریک کرلیا گیا، جو بجرمِ قصاص یا ڈاکہ یا چوری مارے گئے یا گرفتاری کے سلسلہ میں قتل ہوئے، لوگ سوچتے نہیں ورنہ دس سال کی اس طویل مدت میں اگر جنگ کا اطلاق کسی معرکہ یا مہم پر ہوسکتا ہے تو وہ ''بدر'' ہے، جس میں بائیس مسلمانوں اور ستر قریش کے، اسی طرح ''اُحد'' میں ستر مسلمانوں اور تیس قریشیوں کے آدمی کام آئے بشرطیکہ ہزار پندرہ سو آدمیوں کے مجمع اور ان کی باہمی آویزش کا نام بجائے جھڑپ کے جنگ اور (battle) رکھا جائے۔

بہر حال قریشیوں سے جو کچھ چھڑ چھاڑ ہوئی، وہ اسی پر ختم ہوگئی، نہ ''خندق'' میں بازار قتال گرم ہوا، نہ مکہ میں خونریزی ہوئی، اس کے بعد ایک دو معرکے یہودیوں سے ہوئے جن میں ''خیبر'' سب سے اہم ہے، اس میں اٹھارہ مسلمان شہید اور ترانوے یہودی مارے گئے، ''عیسائیوں'' سے ''موتہ'' میں گھمسان کی لڑائی ہوئی، لیکن اس گھمسان میں بھی کل مسلمانوں کے بارہ شہیدوں کا حال معلوم ہوا، اس کے سوا کچھ ڈاکوؤں کا تعاقب ہے، چوروں کا پیچھا کیا گیا، باغیوں کی سرکوبی کے لئے کوئی دستہ روانہ کیا تھا، جس میں اکثر مواقع میں جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی، بہر حال اگر خالص لڑائی اور جہاد کے شہیدوں اور مقتولوں کا حساب کیا جائے تو ان کی تعداد پانچ چھ سو سے زیادہ اس کل دس سال کی مدت کے اندر سارے ملک عرب میں ان شاء اللہ ثابت نہ ہوگی حالانکہ مقابلہ میں عرب کے وحشی قبائل، طاقتور جمہوریتیں اور بعض سلاطین بھی تھے، لیکن جس کو طائف کے بعد سب کچھ دے دیا گیا تھا، کیوں سوچا جاتا ہے کہ اس کو یہ کیونکر ملا، اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا جس کی زندگی کا ہر واقعہ اس کے کلمہ دعوت و دعویٰ ''لا الٰہ الا اللہ'' کی دلیل ہے، آخر ان واقعات میں بھی اس کو

؎ ان واقعات کی تفصیل سیرت کی بڑی کتابوں میں پڑھو یا دیکھو میری کتاب ''الحرب والجہاد''۔

کیوں نہیں ڈھونڈا جاتا، الغرض یہ ہیں کل دس سال اور وہ سارے جنگ وجدال جن کے خون کا افسانہ ہزار ہا بوقلموں (رنگارنگ) رنگوں سے رنگین کر کے دنیا کو سنایا جاتا ہے۔

اب دیکھو کہ جہاں انسان، مسجودِ ملائکہ انسان کی جان ایک مچھر اور مکھی سے بھی زیادہ قیمت نہیں رکھتی تھی، اس کی جان تو بڑی چیز ہے، اس کے کپڑے کا دھاگہ بھی رات کے اندھیروں میں کوئی نکال نہیں سکتا، امن وامان کا دور دورہ ہے، عالم پر منطبق (برابر) کرنے کے لئے انسانی زندگی کے جس آئین ودستور کا نقش مدینہ کے پرچم میں کاڑھا گیا تھا اس کے نیچے چلے آتے ہیں، بے تابانہ چلے آتے ہیں، آدم کے بچے ہر چہار طرف سے چلے آتے ہیں، فوج درفوج چلے آتے ہیں، وفود کا تانتا (مجمع) بندھ جاتا ہے۔[1]

پھر کیا مدینہ میں جو پایۂ تخت قائم ہوا، وہاں منبر کی جگہ تخت بچھایا گیا، وہی منبر ہے، وہی مسجد ہے، وہی جھونپڑے ہیں، وہی چمڑے کا اکہرا (ایک ہی تہہ کا) گدا ہے، نہ حاجب ہے، نہ دربان ہے، امیر بھی آتے ہیں، غریب بھی آتے ہیں، دونوں کے ساتھ ایک معاملہ ہے عجب دربار!

سلاطین کہتے ہیں، شاہی دربار تھا کہ فوج تھی، علم تھا، پولیس تھی، جلاد تھے، محتسب تھے، گورنر تھے، کلکٹر تھے، منصف تھے، ضبط تھا، قانون تھا۔

مولوی کہتے ہیں مدرسہ تھا کہ درس تھا، وعظ تھا، افتاء تھا، قضاء تھا، تصنیف تھی، تالیف تھی، محراب تھی، منبر تھا۔

صوفی کہتے ہیں خانقاہ تھی کہ دعا تھی، جھاڑ تھا، پھونک تھی، ورد تھا، وظیفہ تھا، ذکر تھا، شغل تھا، تحنث (چلہ) تھا، گریہ تھا، بکا (فریاد) تھا، وجد (بے خود) تھا، حال تھا، کشف تھا، کرامت تھی، فقر تھا، فاقہ تھا، زہد تھا، قناعت تھی، کنکریاں دی جاتی تھیں کہ کھارے

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھو میری کتاب "المکاتیب"۔

کنوؤں کا پانی میٹھا ہو جائے، بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرا جاتا تھا، جس کو جو کہہ دیا جاتا تھا، پورا ہوتا تھا۔

مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ سب کچھ تھا، اس لئے کہ وہ سب کے لئے آیا تھا، آئندہ جس کسی کو چلنا تھا، جہاں کہیں چلنا تھا، جس زمانہ میں چلنا تھا، اسی روشنی میں چلنا تھا۔

بیرونِ عرب میں تبلیغ کا کام

اور یہ تو عرب کے لئے ہوا، عرب ہی کے اندر دیکھو کہ عرب کے باہر کا کام شروع ہو جاتا ہے، اسی دس سال کے عرصہ میں مشرق کی سب سے بڑی قوت ''پرشین امپائر'' (ایران) اور مغرب کی سب سے بڑی طاقت ''رومن امپائر'' (روم) کے ساتھ اطراف و جوانب کے سلاطین کو بھی چونکا دیا جاتا ہے کہ وقت سے پہلے جاگ جاؤ، جو جاگا اس نے پایا، جو سویا اس نے کھویا، ''کسریٰ'' نے خط پھاڑا، اس کا ملک پھاڑ دیا گیا، ''قیصر'' بھی پھاڑ دیتا اور خدا کرتا کہ پھاڑ دیتا تو وہ بھی پھٹ جاتا، لیکن معاملہ کو ملتوی کر کے اس نے اپنی قوم اور اپنے ملک کی موت کو ملتوی کرا لیا۔

اور اتنا ملتوی کیا کہ گویا وہ فوج آج تک واپس نہیں آئی، اور خدا ہی جانتا ہے کہ کب واپس [1] ہوگی، جسے رومیوں [2] کی طرف روانہ کر کے دماغ کے ان عجیب و غریب

---

[1] مشہور محدث ابوبکر بن العربی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں ایک روایت نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فارس (ایران) ایک سینگھ یا دو مار کر ختم ہو جائے گا لیکن روم (یورپ) کے ایک سینگھ کو مسلمان توڑیں گے تو دوسرا سینگھ نکل آئے گا اور اسی طرح نکلتا چلا جائے گا جب تک اللہ چاہے، آج چودھویں صدی کا نصف بھی گزر چکا، یورپ کے سینگھ نکلتے چلے آرہے ہیں۔

[2] مرض الموت میں اسامہ کا جو دستہ رومیوں کی طرف بھیجا گیا اسی کی طرف اشارہ ہے، رومیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر ملی ابھی اس خبر کی مسرت ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ اسامہ رضی اللہ عنہ کے حملہ کی خبر ان کو ملی، رومی گھبرا اٹھے اور بولے کیا یہ لوگ جن ہیں؟۔

تجربات دینے والا پاک وجود پھر ''دل'' کے حالات میں مستغرق ہو کر اس بستر پر لیٹ گیا، جس پر لیٹنے کے بعد پھر اٹھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اللّٰھمّ صلّ علیہ وسلّم۔

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس بستر پر لیٹنے کی جو آخری رات تھی اس کے روشن کرنے والے چراغ میں تیل کسی غریب پڑوسی سے قرض کر کے آیا تھا، اور جو چادر اس وقت مرضِ واپسیں (مرضِ وفات) کے مریض پر پڑی تھی جب بعد کو دیکھا گیا تو صرف پھٹا ہوا ایک سیاہ کمبل تھا، جس کے اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے، اس کی زرہ تین صاع پر ایک یہودی ساہوکار کے یہاں گرو تھی۔

جاننے کے بعد نہ ماننے کے لئے جھوٹ کے بلوں میں پناہ پکڑنے والو! سوجھ رہا ہے، دیکھ رہے ہو جو اس بستر پر لیٹا ہوا ہے، انصاف کے خونیو! کیا یہی مکہ کا وہ فقیر ہے جس کے متعلق تمہاری گندی زبانوں نے غل مچایا کہ وہ مدینہ کا بادشاہ ہو گیا تھا اور کیا آج ہی اس کا یہ حال ہے، دس سال کی اس مدت میں کس نے اس کے گھر سے روز دھواں اٹھتے ہوئے دیکھا؟ ایسے بادشاہ کس دنیا میں گزرے ہیں جن کے منہ کو جَو کے بے چھنے آٹے کی روٹی بھی میسر نہ آئی؟ فقیروں نے بھی کبھی دو دو تین تین مہینے تک صرف پانی اور خشک چھوہاروں پر زندگی گزاری ہے؟ فاقہ مستوں نے بھی کبھی بھوک کی شدت میں پیٹ پر دو دو پتھر باندھے ہیں؟ کن بادشاہوں کی لڑکیوں کے ہاتھ میں چکی پیسنے کا گھٹا اور گردن میں پانی بھرنے کے نشان دیکھے گئے؟ ایسی شاہزادی زمین کے کس خطے میں پائی گئی، جس کو اور جس کے بچوں کو دو دو تین تین دن بھوک کی شدت میں دن کو رات اور رات کو دن کرنا پڑا ہے؟ بادشاہوں کا قصر (محل) کیا اسی کو کہتے ہیں جس کے کھجوروں کے پتوں کے چھپر سے بھی آدمی کا سر لگتا ہو۔

مدینہ کے بادشاہ کا شاہی محل تو اس وقت بھی موجود ہے اس کے طول و عرض کو تو

اب بھی ناپ سکتے ہو، باہر میں اس کے کچھ بھی ہو لیکن اندر تو اس کا وہی ہے جو پہلے تھا۔ [1]

بہر حال دس سال تک ''دماغ'' کا بھی اس طرح کھلی روشنی میں تجربہ کرایا گیا، جس طرح تیرہ سال تک ''دل'' کے مشاہدات پیش کئے گئے۔

اور تم دیکھو کہ اسی عرب میں ایک طرف ان کا نشہ اتارا گیا جن کی بڑائی میں خدا کی کبریائی بھی گنجائش نہ تھی، تو دوسری طرف ان ہی میں ایک اور نشہ پیدا ہو گیا کہ خدا کی بڑائی کے سوا ان کے اندر کسی کی بڑائی باقی نہ رہے، یہی وہ گروہ ہے جو سینا کی روشنی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملائکہ قدوسیوں کی شکل میں نظر آیا، وہی دعویٰ جس کی دلیلیں مسلسل خود اپنے اندر سے اس دعوے کا مدعی اعلان سے پہلے چمکا رہا تھا، اسی دعوے کے نسخہ کو ان پر بھی پیش کیا گیا، جنہوں نے جان کر اس کو مانا تھا یہ نسخہ ان کو پلایا گیا۔

اور کسی جنگل یا پہاڑ کے غاروں میں نہیں تلواروں کی چھاؤں میں اس کی مشق کرائی گئی۔

پلا کر بھی دکھایا جاتا تھا اور چھڑا کر بھی دکھایا جاتا تھا، ''بدر'' میں جب پی کر اترے تو اس کے نتائج بھی ان کے سامنے تھے اور ''احد'' میں جو کچھ ہوا، ان ہی کی بدولت ہوا جن سے پینے میں کچھ کوتاہی ہوئی، مکہ جب فتح ہوا تو سب اسی نسہ میں سرشار تھے، ''حنین' میں جب میدا، چھوٹا، تھوڑی دیر کے لئے چھوٹا تو تم اس کے میدان کے نقشے میں اور اس کی گھاٹیوں، پہاڑیوں میں اس کے اسباب کو کھوجو! لیکن میں کیا کروں کہ قرآن نے اسی نشہ کی لی کا ان میں نشان دیا ہے جس کا ان کو تجربہ کرایا جا رہا تھا۔

تم کہتے ہو کہ وہ تیر اندازوں سے بھاگے جو اندر نہیں بلکہ باہر گھاٹیوں پہاڑوں میں چھپے ہوئے تھے اور قرآن کہتا ہے کہ وہ Majority اور اکثریت کے اس اعتماد سے

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھو ''نبی اور اس کی زندگی''۔

بھاگے، جوان کے اندر چھپا ہوا تھا:

﴿وَ یَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْکُمْ کَثْرَتُکُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْکُمْ شَیْئًا﴾

''اور حنین کے دن جب اپنی کثرت تعداد نے تم کو مغرور کیا لیکن یہ کثرت تعداد تم کو فائدہ نہ پہنچا سکی۔''

کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے۔

اگر یہ مقصود نہ تھا تو جس کو طائف سے واپسی کے بعد سب کچھ مل چکا تھا اس کو اس ''لاؤ'' اور اس ''لشکر'' کی کیا ضرورت تھی، یوں بھی تو اس کا داہنا ہاتھ [1] عجیب وغریب کمالات دکھاتا تھا، یہ غرض نہ ہوتی تو کیا صرف اسی سے وہ سب کچھ نہیں کرسکتا تھا، اور جب جی چاہا تو کیا خاک کی مٹھی سے اس نے وہی کام نہیں لیا جو ہولٹرز کے گولوں سے لیا جاتا ہے۔

اندھے ہیں جو کہتے ہیں کہ وہ خون بہاتا تھا، جس کا خون بہایا گیا، جس کی داڑھی خون سے دھوئی گئی، جس کے دانت توڑے گئے، جس کی پیشانی میں ''زرہ'' کی کڑیاں چھبائی گئیں، نابیناؤ! اسی پر الزام دھرتے ہو کہ اس نے خون بہایا۔

چورو! کوتوال (تھانیدار) ہی کو الٹا ڈانٹتے ہو، اور بکف چراغ ہو کر ڈانٹتے ہو، حالانکہ تریسٹھ سال کی طول مدت عمر میں کیا کوئی ثابت کرسکتا ہے کہ خونیوں میں پلنے والے اس انسان نے خون تو کیا کسی کا بال بھی توڑا تھا۔ [2]

---

[1] زبور کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں آنحضرت ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا: ''تیرا داہنا ہاتھ عجب دکھلائے گا۔'' قرآن میں آنحضرت ﷺ کے داہنے ہاتھ کو خدا کا ہاتھ قرار دیا گیا اور ﴿وَ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ﴾ میں بھی داہنے ہاتھ کے کمالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، مشت خاک سے دشمنوں کی فوج میں ابتری پیدا ہوئی، اس کا ذکر بخاری میں ہے۔

[2] پوری تاریخ میں صرف ابی بن خلف کے حلق میں آپ ﷺ نے نیزہ کی انی اس وقت چبھائی، جب وہ آنحضرت ﷺ کے قتل کے لئے جنگ احد میں آپ ﷺ کے قریب پہنچ گیا، آپ ﷺ نے مکہ معظمہ میں اس سے ایک وعدہ کیا تھا، اس کا ایفاء بھی مقصود تھا۔

اسلامی جہاد کی ترتیب

اُف! اگر وہ خون بہانا چاہتا تو پھر ہزاروں کے خون کو صرف ایک کے خون سے کیوں بچاتا، قطرہ بہا کر سمندر کو کیوں باندھتا، یہی یہود جن کا خون ہر زمانہ اور ہر ملک میں تقریباً ہر صدی میں ارزاں رہا ہے اور اب تک ہے[1]، جب خون کے مستحق ہو چکے تھے اور ہر اعتبار سے ہو چکے تھے، لیکن ان کے ہزاروں کے خون کو صرف کعب بن اشرف اور رافع بن حقیق دو ہی آدمیوں کے خون سے کیوں محفوظ کر دیا گیا، بہت بڑا خیر وہ شر ہے جس کے ذریعہ سے کسی عظیم و جلیل شر کا سد باب ہوتا ہو، قصاص (ناحق قتل کا بدلہ) میں زندگی ہے، آخر اس قانون میں اور کیا ہے، بلا شبہ ان دونوں کی موت میں ان تمام یہودیوں کی زندگی کی ضمانت تھی جو ان کے بعد زندہ رہے، پھلے پھولے، ورنہ جو منصوبہ ان دونوں نے پکایا تھا[2]، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عرب سے یہودیوں کا اسی وقت نام و نشان جاتا رہتا، جیسا کہ ہمیشہ اس قسم کے بد باطن یہودیون نے اپنی قوم پر ہر ملک میں ہر زمانہ میں زندگی تلخ کی ہے، جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ بنی قریظہ کی چھوٹی جماعت اگرچہ ان ہی کی شریعت، ان ہی کے حکم سے مٹائی گئی، لیکن اسی کے ساتھ کیا اس چھوٹی جماعت کی موت میں عرب کے سارے یہودیوں کی زندگی مستور (چھپی ہوئی) نہ تھی، سنگدل اور ظالم ہے وہ جراح (سرجن) جس نے ایک انگلی کے لئے پورے جسم کو سڑنے دیا۔

---

[1] جرمنی میں ہٹلر نے ان پر زندگی جس طرح تنگ کی ہے سب کو معلوم ہے، یہ تفسیر ہے قرآن کی آیت کی:
﴿وَ إِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ﴾ (الاعراف:۶۷) ''تیرے رب نے جب اعلان کیا کہ قیامت تک یہودیوں پر کسی کو اٹھاتا رہے گا جو ان کو بری طرح عذاب چکھاتا رہے گا''۔

[2] تفصیل کے لئے دیکھو ''سیرت النبی ﷺ'' از شبلی مرحوم۔

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن

آخر میں ان تمام تجربات کے سلسلہ میں نادر ترین تجربہ یہ ہے کہ یہی دس سال کا زمانہ ہے، اس کے بعد بھی چند سال گزر چکے ہیں اور اب وہی جو عرب کے لئے بھی تھا، عجم کے لئے بھی تھا اور عورتوں کے لئے بھی تھا، مردوں کے لئے بھی تھا، زندگی کے آخری دنوں میں ارادہ فرمایا جاتا ہے کہ جس طرح مردوں میں قدوسیوں کی یہ آخری جماعت پیدا کی گئی ہے، سارے جہاں کی عورتوں کے لئے قیامت تک نسل انسانی میں جو عورتیں پیدا ہونے والی ہیں، ان سب کے لئے، ان کی تعلیم کے لئے، تربیت کے لئے، ان کے نمونہ کے لئے، عورتوں کی بھی ایک جماعت تیار کی جائے، شاید یہ قدرت کی طرف سے تھا اور اس کی کون سی بات قدرتی نہ تھی کہ جہاں سے دنیا کے اس عالمگیر نقشے اور حیات انسانی کے کامل دستور العمل (قانون، Constitution) کا جھنڈا اُٹھایا جاتا ہے۔

مدینہ میں دنیا کے مذاہب کا اکھاڑہ

وہ نہ ''لندن'' ہے نہ ''پیرس'' حتیٰ کہ ''بمبئی'' بھی نہیں اور ''کلکتہ'' بھی نہیں، بلکہ سوچو تو بیابان کی اس کوردہ آبادی (غیر معروف چھوٹا گاؤں) کی تمدنی وعمرانی لحاظ سے وہ حیثیت بھی نہیں جو ہندوستان کے معمولی اضلاعی شہروں اور قصبوں کی ہے، لیکن دنیا کے اسی دُور اُفتادہ (دوری کے فاصلے پر) ویران، ریگستان، نخلستان میں حیرت ہے کہ سارے جہاں کے مذاہب وادیان اس لئے اس کے آگے پیش ہو جاتے ہیں کہ تردید وتکذیب نہیں بلکہ سب کی تصدیق، سب کی تصحیح، سب کی تکمیل، عملی شکل میں ممکن ہو کہ وہ ''مکذب'' (جھٹلانے والا) نہیں بلکہ ''مصدق'' (تصدیق کرنے والا) تھا اور یہی اس کے دعویٰ کا سب سے بڑا امتیازی نشان ہے۔

ہندو مذہب تو وثنیت (بت پرستی) کی شکل میں مکہ ہی میں موجود تھا، مدینہ آنے کے بعد اس کے آگے دنیا کا دوسرا عالمگیر مذہب یہودیت بھی سامنے آ گیا، اس کے ساتھ خود "مدینہ" میں وہ "نصرانیت" بھی موجود تھی جس کے زیر اثر دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ اس وقت بھی تھا اور اس وقت بھی ہے، اس کے حلقہ میں "مجوسی" اور ایران کے آتش پرست زردشتی بھی [1] شریک تھے، اور اردگرد میں ایک فرقہ صابئوں (ستارہ پرستوں) کا بھی تھا، جس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ عرب کے صابئوں کا تعلق بودھ مذہب کے سادھوؤں (فقیروں) سے تھا، یا ان کے سوا کوئی اور فرقہ تھا جسے دنیا اب نہیں جانتی ہے۔ [2]

الغرض کوہستان کی اس چھوٹی سی بستی میں یہودیت، عیسائیت، ہندویت یا وثنیت، مجوسیت، اور چاہو تو کہہ سکتے ہو کہ بودھیت اپنے تمام مفاسد کے ساتھ موجود تھے، جن کے دھونے، اور جن سے پاک کرنے کے لئے وہ اٹھایا گیا تھا، پس اس نے ان سب کو دھویا، ان سب کو پاک کیا، صاف کیا، جس میں جو کمی تھی سب کو پورا کیا اور قیامت تک کے لئے پورا کیا۔

اور جس طرح دنیا کے ہر مذہب کے مردوں میں قدرت نے اس کو کچھ لوگ دیئے دیکھو کہ قریب قریب کچھ اس طرح سے زندگی کے آخری دنوں میں تقریباً دنیا کے ان تمام بڑے مذاہب کی عورتوں میں سے ایک ایک نمائندہ اس کی خدمت میں قدرت کی ہی جانب سے حاضر کی جاتی ہے، عورتیں اس کی خدمت میں اگر عورتوں کی حیثیت سے آتیں تو کیا وجہ تھی کہ جب مکہ میں ہر قسم کی یہی عورتیں اس کے آگے پیش کی گئیں تو اس بزرگ خاتون کے

---

[1] سلمان فارسی، باذان، اقرع بن حابس رضی اللہ عنہم اور بھی چند ہیں، یہ پہلے مجوسی تھے، اور "ہجر" کا پورا علاقہ عرب میں زردشتی دین رکھتا تھا، قرآن میں "مجوس" کے نام سے ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

[2] تفصیل کے لئے دیکھو میری کتاب "صابئون"۔

مقابلہ میں جو عمر میں ان سے پندرہ سال بڑی تھیں، پچاس سال کی عمر تک کسی کو پسند نہیں کیا، پچیس سال کی جوانی سے پچاس سال کی عمر تک تم میں کون نہیں جانتا کہ بجز حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے نکاح نہیں فرمایا، جو نکاح کے وقت چالیس سال کی ہو چکی تھیں، اور اس سے پیشتر ان کے دو شوہروں کا انتقال ہو چکا تھا، جو عورت [1] کو عورت کی حیثیت سے اپنے گھر لاتا ہے، کیا چالیس سال کی بیوہ کے ساتھ پچاس سال کی پوری زندگی گزار سکتا ہے۔

ہاں! جب سب کچھ ہو چکا ''دل'' کا بھی تجربہ ختم ہو چکا، ''دماغ'' کے تجربات بھی دنیا کے سامنے آچکے، قتل وخون، فتنہ وفساد کا متلاطم (جوش مارتا ہوا) سمندر ملک عرب، امن وامان، راحت وآسائش کی چھاؤں کے نیچے زندگی کی قیمت حاصل کرنے لگا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگرچہ عرب کا اکثر حصہ ہمیشہ سے کسی غیر عرب کا محکوم (غلام) نہ تھا لیکن باہم ان میں بڑوں نے چھوٹوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا اور پھر سب مل کر وہمی مخلوقات کی غلامی کی رسیوں میں گھسٹ رہے تھے، اس غلامی سے ان کو حقیقی آزادی میسر آئی، انسانیت اپنے فطری مقام سے ہٹ کر موچ کھائی ہوئی ہڈی کے مانند بے چین تھی، بے کل (بے قرار) تھی، پھر اس کو اپنا وہ اصلی مقام نصیب ہوا جس پر پہنچے بغیر قلوب انسانی مطمئن نہیں ہو سکتے، ایسی صورت میں پھر یہ کیسا بد اندیشہ اور خبیث خیال ہے کہ آزادی کی اس نعمت سے ایک پورے طبقہ نصف حصہ کو محروم رکھا جاتا، یہ سچ ہے کہ ان کا، بے زبانوں کا کسی نے خیال نہیں کیا، رحم کی نگاہ کسی کی ان پر نہیں پڑی، لیکن کیا کہتے ہو کہ ''رحمۃ للعالمین'' کی نظر کرم سے بھی یہ بے چاریاں محروم رہتیں، جس طرح اب تک تھیں، ایسا نہیں ہو سکتا تھا، جو

---

[1] کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کا یہی ترجمہ نہیں؟ "مالی فی النساء من حاجة" رواہ دارمی (عورتوں کے ساتھ میری کوئی ضرورت وابستہ نہیں)۔

سب کے لئے تھا، وہ سب ہی کے لئے ہوا، اور یہی ہونا بھی چاہئے تھا، اس نے بے سمجھ، خام فہم، ناتجربہ کار عورتوں کا انتخاب نہیں کیا کہ ان کو دوسروں کے لئے نمونہ بنانا تھا اور دیکھو! وقت بھی کم ہے، فرصت تنگ ہو رہی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ چُن چُن کر مختلف طبائع اور مزاج، مختلف مذاہب اور ادیان کی سن رسیدہ (پکی عمر)، فہمیدہ (سمجھ دار) وسنجیدہ، بیوہ عورتیں جو زندگی کے سرد وگرم کا تجربہ کر چکی تھیں، ان کی ایک برگزیدہ، پاک منتخب جماعت کو مختلف اسباب ووجوہ کے پردہ میں قدرت نے اس کی خدمت میں اس وقت مہیا کیا، جب اپنے فرض سے سبکدوشی کا وقت آخر ہو رہا تھا، اس کی زندگی کا یہی آخری کارنامہ تھا، کھل چکا تھا کہ مکہ فتح ہوتا ہے، خدا کی زمین کا ''مرکز'' جھوٹے خداؤں کی نجاست سے پاک ہوتا ہے، جس کے بعد اس کا کام ختم ہو جاتا ہے۔

میں بتا چکا ہوں کہ ''غیب'' اور اس کے ''آیات کبریٰ'' جس وقت کھولے گئے تھے، آخر میں بانی ''کعبہ'' ابراہیم علیہ السلام کا دیکھنا اسی کی دلیل تھی کہ کعبہ کی تطہیر اس کا آخری کام ہوگا، ''مرکز'' اور ا''اُمّ القریٰ'' (مکہ) پر قبضہ دلانا اصل کام تھا، اس کے بعد مفصلات (شہر کے اِرد گرد کے قصبات اور دیہات) اور ''اُمّ القریٰ'' کے ''قریٰ'' جو کعبہ کے چاروں طرف زمین کے آخری حدود تک پھیلے ہوئے ہیں، ان کا کام آنے والوں کے سپرد کر دیا جائے گا، اور اسی غیبی مکاشفہ (غیبی امور کے انکشاف) میں نہیں بلکہ مسلسل ایسے مکاشفے (انکشافات) مختلف پیرایوں میں ہو رہے تھے، جن کا مطلب یہی تھا کہ کام ختم ہو رہا ہے، پس اس کام کو کامل طور پر ختم کرنے کے لئے مردوں کے ساتھ عورتوں کی تعلیم و تربیت[1] کا کام اپنی آخری زندگی میں اس کو اپنے سر لینا پڑا، یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ عورتیں خدمت

---

[1] اے نبی کی عورتو! تم عام عورتوں جیسی نہیں ہو یا اے نبی کی عورتو! اگر تمہیں دنیا اور دنیا کا سنگار بناؤ پسند ہے، تو آؤ، ہم تمہیں جدا کر دیتے ہیں، یاد کرو ان آیتوں کو جو کتاب میں آئیں نازل ہوئیں اور حکمت کی باتیں ''قرآنی آیتوں'' کے ان تراجم کا کیا مطلب ہے۔

مبارک میں اسی حیثیت سے رہتیں، جس حیثیت سے مردوں کی ایک منتخب اور چیدہ جماعت ساتھ رہتی تھی، لیکن دماغ کی بیداری کا یہ کیسا روشن تجربہ ہے کہ اس نے ان عورتوں سے نکاح کر کے مصنوعی، مذہبی مقتداؤں اور روحانی پیشواؤں کی ان مجرمانہ پیش قدمیوں کا راستہ ہمیشہ کے لئے مسدود (بند) کر دیا۔

ہیکل کی خدمت کے لئے عمران [1] کی عورت نے صرف ایک لڑکی پیش کی تھی، پھر دیکھو، اس کنواری کی آڑ میں چرچوں پر، گرجاؤں پر، ان کے اماموں پر، خطیبوں پر، رہبانوں پر، بطریقوں (عیسائی پیشوا) پر، کتنی کنواریاں روز بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں، خدا نخواستہ اگر کسی ایک اجنبی عورت کو نزدیکی کی وہ حیثیت دی جاتی جو باہر میں مردوں کو حاصل تھی، تو کون اندازہ کر سکتا ہے کہ بعد کو آدم رو ابلیسوں (شیطان نما انسان) کے لئے قرب و نزدیکی کا یہ حیلہ کن خباثتوں اور شرارتوں کی بنیاد بن جاتا، جب کوئی نمونہ موجود نہیں ہے، اس وقت تو بغیر نمونہ کے زندگی گزارنے والوں نے فتنے برپا کیے، خدانخواستہ اگر ''نیم بیضہ'' (آدھا انڈا) بھی میسر ہو جاتا تو پھر سیخ میں کتنے ہزار مرغ گھتے (چڑھائے) جاتے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ [2]

---

[1] مشہور قصہ حضرت مریم علیہا السلام کا ہے کہ ان کی والدہ امرأۃ عمران (عمران کی بیوی) نے نذر مانی کہ میرے پیٹ میں جو کچھ ہے اللہ کی نذر ہے، اتفاق سے لڑکی پیدا ہوئی، انہوں نے اس کو ہیکل سلیمانی کی نذر کر دیا، ان کے اس نمونہ نے عیسائیوں میں ''ننوں'' کی جماعت پیدا کی جن کے مفاسد سے انسانیت چیخ اٹھی ہے۔

[2] شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے گلستان میں لکھا ہے کہ: نوشیروان بادشاہ نے کہا کہ ہر ظلم کی بنیاد شروع میں تھوڑی ہوتی ہے پھر جو شخص آیا اس نے اس پر اضافہ کیا یہاں تک کہ ظلم اس حد تک پہنچ گیا کہ اگر بادشاہ عوام کے باغ سے ایک سیب بلا قیمت کھائے گا تو اس کے غلام درختوں کو اس کی جڑ سے اکھاڑ دیں گے، بادشاہ اگر آدھے انڈے کے برابر یعنی تھوڑا سا ظلم بھی جائز رکھے گا تو اس کے سپاہی ہزار مرغ سیخ پر کباب بنا ڈالیں گے یعنی بڑے بڑے ظلم کر گزریں گے۔ [م-ع-ا]

الغرض ان عورتوں کو بیوی کا مقام عطا کیا، اور جس کو انسان سوچ نہیں سکتا، اس حد تک ان کے ساتھ حقیقی عدل اور برابری کا نمونہ اس نے پیش کیا، جس کا ''دماغ'' عالمگیر حکومت، عالمگیر سیاست، ہمہ گیر تعلیم وتربیت کی الجھی ہوئی پیچ در پیچ گتھیوں (نہایت مشکل گرہوں) کو سلجھانے میں اسی وقت مصروف تھا جس وقت ''عائلی'' اور خانگی'' زندگی کی ژولیدگیوں (پریشانیوں) کو بھی بہ کشادہ پیشانی حل کر رہا تھا، اور اس آسانی کے ساتھ حل کر رہا تھا کہ خواہ اس کی مدت کتنی ہی کم ہو لیکن بداندیشوں، یاوہ (فضول وبیہودہ) خیالوں کو دور سے زندگی ایسی سلجھی ہوئی خوشگوار لذیذ نظر آئی کہ بدبختوں نے اپنے اندر برے خیالات پکائے [1]، گویا سچ مچ اس خیر میں کوئی شر نہیں اور اس راحت میں کوئی زحمت نہیں تھی، ایک بیوی کے تعلقات کی شیرینی (مٹھاس) کو مسلسل تلخیوں (کڑواہٹ) سے بدلنے والے کیا یہ سوچ سکتے ہیں؟ البتہ اس کا اندازہ ضرور کر سکتے ہیں کہ چند بیویوں کے تعلقات کو خوشگوار رکھنا فطرت انسانی کا اعجاز نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ بلاشبہ یہی ایک عائلی تجربہ بھی ان بددماغوں اور بدعقلوں کے لئے کافی ہے جو جاننے کے بعد ماننے سے اس لئے ہچکچاتے تھے کہ ''دل'' میں تو نہیں، لیکن ''عقل'' اور ''دماغ'' کے نظم میں ان کو بدنظمی کا اندیشہ ہوا، جس کی زندگی کا ہر شعبہ شخصی، عائلی، خاندانی، قومی، سیاسی صرف ضبط اور نظم ہے، اس کے متعلق یہ وسوسہ خود

---

[1] ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کے نکاحوں کا سلسلہ ہجرت کے بعد شروع ہوا اور اس میں بھی عموماً آخر عمر میں، حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر تین ساڑھے تین سال سے زیادہ زمانہ ان ازواج کو نکاح کے بعد نہ ملا، اور یہی زمانہ آنحضرت ﷺ کے جہادی اور حج وغیرہ اسفار کا ہے، اس کا اور عدل کے قانون پر شدت کے ساتھ عمل پیرا ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ تریسٹھ سال کی پوری زندگی میں عموماً ان بیویوں کے پاس آنحضرت ﷺ کے قیام کی مدت تین ساڑھے تین مہینے سے زیادہ نہیں جو تعلیم کے لئے بھی کافی ہے اور جن شکوک وشبہات کا پروپیگنڈا دشمنوں نے کیا ہے، اس کی تردید کے لئے بھی، یہ سب کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اتنی شادیاں کیں، لیکن یہ کوئی نہیں کہتا کہ کب ہوئیں اور ان عورتوں کے ساتھ قیام کی مدت تریسٹھ سال کی عمر میں کتنی ہے؟ تفصیل کے لئے دیکھو میری کتاب ''ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن''۔

سوچنے والوں کی کیا عقلی بدنظمی کی کھلی دلیل نہیں ہے؟ یہی نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ زندگی کے اس قلیل حصہ کا کوئی دقیقہ، کوئی نکتہ ایسا نہ تھا، جو نگاہ سے اوجھل ہو، دیکھ چکے کہ دنیا کی عورتوں کے لئے جو نمونہ بنائی گئی، ان میں سب کی سب عمر رسیدہ، تجربہ کار، بیوہ عورتیں ہیں جیسا کہ مردوں کے لئے جو جماعت نمونہ بنائی گئی، ان میں زیادہ تر تجربہ کار سرد وگرم چشیدہ لوگ تھے، ایک ایک ان میں ایسا تھا جو ملکوں پر بھاری، قوموں پر گراں (بھاری) ثابت ہوا۔ [1]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حیثیت

لیکن دقیقہ سنجیوں (ہوشیاری)، نکتہ نوازیوں (قدردانی) کے اس سلسلہ میں انتہا اس وقت ہوتی ہے جب کہ ایک طرف اگر مَردوں کے نمونہ میں ایک ایسا نمونہ ہے جس کا ''دل''، جس کا ''دماغ''، جس کا ''ظاہر''، جس کا ''باطن'' ہر قسم کے اجنبی اثرات سے قطعاً آزاد ہے، اسی صحبت میں اس نے آنکھیں کھولیں، ان ہی کی گود میں اس نے ہوش سنبھالا، آخر وقت وہ اسی حال میں رہا۔

پھر جس طرح مردوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شکل میں ایسا نمونہ دیا گیا، جو دو سال کی عمر سے اس وقت خدمت مبارک سے علیحدہ ہوئے جب لوگوں نے مرقد انور (قبر مبارک) سے ان کو نکلتے دیکھا۔

کیا ظلم نہ ہوتا اگر عورتوں، بے زبان عورتوں کو اس بے نظیر، ناگزیر نمونہ سے محروم رکھا جاتا، یہی وجہ ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ سن رسیدہ اور ادھیڑ بلکہ بعض بوڑھی عورتوں کے اسی مجمع میں ایک وہ طاہرہ، طیبہ، صدیقہ، کنواری بیوی صاحبہ بھی ہیں، جن کو آپ نے اپنے زیر اثر سات (۷) ہی سال میں لے لیا اور قبل اس کے کہ ان کا ''دل'' ان کا ''دماغ''، کسی غیر نبوی

---

[1] ازواج مطہرات سے متعلق کتاب کے آخر میں ضمیمہ ملاحظہ فرمائیں۔

اثرات کو غیر شعوری طور پر جذب کرے، نویں (۹) سال کی عمر میں اپنی رفاقت میں لے لیا، عموماً سفر و حضر میں ساتھ رکھا، پھر دیکھو کہ جس طرح مردوں کے اس مظہر عجائب وغرائب وجود سے دنیا کو اگر وہ سب کچھ ملا، جو کسی دوسرے سے نہیں ملا، تو کیا ٹھیک اسی طرح اس عجیب وغریب، ذہین وذکاء، فضل وکمال، تقویٰ وعفت کے سرچشمہ سے دنیا کو جو دولت تقسیم ہوئی، صرف عورتوں ہی میں نہیں کہ وہ تو ان کا گروہ ہی تھا، غالباً مردوں کو بھی کسی دوسرے سے اتنا نہیں ملا؟

محدثین سے پوچھو! کہ وہ کیا کہتے ہیں؟[1]

الغرض ہر قسم کے شکوک وشبہات، وساوس واوہام کی تاریکیوں، ادنیٰ سے ادنیٰ تاریکیوں کو پھاڑتا چیرتا ہوا، دعویٰ کا وہ آفتاب جس کی صبح کا سپیدہ (سفیدی روشنی) حراء کے دامن سے پھوٹا تھا، ''مکہ'' کے افق سے چڑھتا ہوا تیئس سال کی مدت میں مدینہ کے سمت الراس (اوپر سر کی طرف) پر پہنچ کر انتہائی کمال وجلال کے ساتھ دیکھو کہ کس شان، کس آن کے ساتھ چمک رہا ہے، آفتاب! دعویٰ کا یہ عجیب وغریب آفتاب جس کے طلوع سے پہلے بھی روشنی تھی اور جس کے ساتھ بھی روشنی ہے جس کے باہر بھی روشنی ہے جس کے اندر بھی روشنی ہے اور خود بھی نور ہے، جس سے نکلا، وہ بھی نور ہے ''نُوْرٌ عَلٰی نُوْر'' کا یہی نورانی نظارہ جس کو دنیا کی آنکھوں کے نور نے کبھی نہیں دیکھا تھا، لیکن ہمیشہ دیکھتی رہے گی، سب کو دکھایا جائے گا، سب دیکھ رہے ہیں، ظاہر کے، باطن کے، دل کے، دماغ کے تجربات بینہ کی شعاعوں سے آسمانی علم اور لاہوتی عرفان کا یہ آفتاب دمک رہا ہے، چمک رہا ہے، بلکہ سچ پوچھو تو بھبھک (بھڑکنا اور گرم ہونا) رہا ہے، لہک رہا ہے، چھلک رہا ہے۔

عرب کا وسیع صحرا اُس کے لئے تنگ ہے، وہ بڑھنا چاہتا ہے، طوفان کی طرح

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھیے: ''سیرت عائشہ رضی اللہ عنہا'' از مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ۔

بڑھنا چاہتا ہے، آندھی کی طرح بڑھنا چاہتا ہے اور دیکھو کہ وہ بڑھ گیا، چڑھ گیا، ساری دنیا پر پھیل گیا اور اب تک اسی آب وتاب، جاہ وجلال کے ساتھ، کائنات کے افق پر اسی طرح چمک رہا ہے جس طرح وہ اس وقت چمک رہا تھا، جب وہ عرب سے باہر نکلا، یقین وقطعیت کی تیز اور ٹھنڈی روشنی میں اس کو آج والے بھی اسی طرح پا رہے ہیں، جس طرح کل والوں نے اس کو اس وقت دیکھا تھا، جس وقت وہ ان کو، ان کی ایک بڑی جماعت کو، اپنی زندگی کے عمیق سے عمیق (گہرے)، باریک سے باریک پہلوؤں کا کھلے بندوں (کھلم کھلا) علانیہ تجربہ کرا رہا تھا۔

گلیلی جھیل [1] کے چند ماہی گیر یا مگدھ دیش [2] کے گداگر بھکشو نہیں بلکہ ہزارہا انسان، ایسے انسان جن پر اس عہد کی ساری بڑائیاں ختم ہوتی تھیں، ان میں بادشاہ بھی تھے اور دنیا کے سب سے بڑے بادشاہ، ان میں کمانڈر بھی تھے اور دنیا کے سب سے بڑے کمانڈرز، ان میں دماغ والے بھی تھے سب سے زیادہ بے دار دماغ والے، ان میں دل والے بھی تھے، سب سے زیادہ روشن [3] دل والے، الغرض انسانیت کی جتنی اونچی سے اونچی منزلیں سوچی جاسکتی ہیں، تجربہ کاروں کی یہ جماعت ان کی آخری بلندیوں پر ساری دنیا کے آگے مضبوطی کے ساتھ قدم جما کر اس کا ثبوت پیش کر رہی تھی کہ اس وقت دنیا میں ان سے اونچا کوئی نہیں ہے، کہیں نہیں ہے۔

---

[1] حضرت مسیح علیہ السلام نے جس جھیل کے کنارے حواریوں کو پہلا وعظ کیا، سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے گلیل کی جھیل کے کنارے واقع ایک پہاڑی پر ایک خطبہ ارشاد فرمایا جو کہ بہت مشہور ہوا اور بائبل کے مصنفین نے اسے بائبل کا حصہ بنادیا۔ [م-ع-ا]

[2] بدھ کی تبلیغی جدوجہد کا مرکز جس کا اب ''بہار'' نام ہے، پہلے مگدھ دیش نام تھا، جن لوگوں کو وہ تبلیغ کے لئے مرید بنایا تھا، ان کو بھکشو کہتے تھے، بھیک مانگ کر پیٹ پالتے تھے۔

[3] خلفائے راشدین اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات جاننے والے کیا اس میں شک کرسکتے ہیں۔

نبوت! اَور کیسی عجب نبوت! تجربہ! اور کیسا عجیب تجربہ! کتنا روشن تجربہ، کتنا نکھرا ہوا صاف تجربہ، ہر قسم کی آلائشوں (گندگی) اور کدورتوں (غبار، کینہ) سے پاک وصاف تجربہ، کتنی عظیم دانائیوں کا پرکھا ہوا تجربہ، کتنی نازک ذہانتوں کا جانچا ہوا تجربہ، کتنی روشن فطرتوں کا ناپا ہوا تجربہ، کتنی بے روک، بے جھجک طبیعتوں کا بے لاگ تجربہ، کتنے متوازن معتدل دماغوں کا ناپا تلا تجربہ، چند نہیں، فوج در فوج نسل آدم کی غٹ (جماعت) جوق در جوق افراد کا تجربہ، اتنے افراد کا تجربہ کہ دنیا کی کسی مسئلہ یا حقیقت کے تجربہ کے لئے نہ آج تک انسانوں کی اتنی بڑی جماعت اکٹھی ہوئی اور نہ شاید آئندہ ہو سکتی ہے۔

تجربات ومشاہدات کا یہی حیرت انگیز ذخیرہ تھا جس کی حفاظت ونگرانی کا فرض کسی خانقاہ کے درویشوں یا کسی مدرسہ کے معلموں یا کسی انجمن کے ممبروں یا کسی کانفرنس کے دفتریوں یا کسی افسانہ نگار مؤرخ کی انگلیوں کے سپرد نہیں کیا گیا، بلکہ سب جانتے ہیں کہ زمین پر، روئے زمین پر اس زمانہ کی جو سب سے بڑی قاہرہ (طاقت ور) سلطنت تھی، اس نے اپنا پہلا فریضہ بھی اسی کی حفاظت وتبلیغ قرار دیا، اور اس کا آخری فریضہ بھی یہی تھا، درمیان کے جتنے مقدمات تھے، وہ صرف اسی مقصد کے حصول کے ذرائع تھے، دنیا کی اس سب سے بڑی سلطنت نے اپنی ہر قسم کی قوتوں کو صرف اسی کی نگرانی اور نشر واشاعت کے لئے مخصوص اور محدود کر دیا۔

طاقت کی ان آہنی (لوہے کی بنی ہوئی) زنجیروں کی بندش میں حکومت ہی کی سرپرستی میں اس کی تاریخ کا آغاز ہوا، اور دیکھو کہ مسلسل اسی طرح ایک حکومت دوسری حکومت کو یہ ودیعت سونپتی چلی آئی، حالانکہ زمانے کی اس طویل ودراز مدت میں، زمین کے مختلف علاقوں میں باہم ان سلطنتوں کے دوسرے اغراض ومقاصد میں خواہ جس قدر بھی اختلاف رہا ہو لیکن اس ''آسمانی ودیعت'' (امانت یعنی نبوت) ان ''درخشاں تجربات بینہ''

(روشن دلائل اور تجربات) ان ''عینی مشاہدات'' کی غور و پرداخت (دیکھ بھال)، تبلیغ و حفاظت میں سب کے نقاط وارادے قطعی طور پر متحد تھے، بلکہ ہر حکومت نے کوشش کی کہ سعادت کے اس سلسلہ میں جتنا زیادہ حصہ اس کو مل سکے، اس کے حصول میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا جائے، اس کے لئے مدارس کھولے گئے، خانقاہوں کا جال بچھایا گیا، مجلسیں ترتیب دی گئیں، حلقے قائم ہوئے، تصنیف وتالیف کا باب کھولا گیا، اور بڑے بڑے عظیم پیمانوں پر کھولا گیا، ایسے پیمانوں پر کھولا گیا کہ شاید دنیا کے کسی ایک فن ایک علم کے متعلق نہ کبھی دنیا میں اتنے بڑے بڑے عظیم الشان مدرسے کھلے، نہ تصنیفی کوششوں کا اتنا عظیم حصہ انسانی تاریخ میں کسی ایک علم یا فن کو ملا جتنا کہ اس عجیب وغریب نبوت کے تجربات ومشاہدات کو ملا اور یوں ہی مسلسل بغیر کسی انقطاع (ختم ہونے) اور کسی وقفہ کے ایک قرن (زمانے) سے دوسرے قرن تک، ایک نسل سے دوسری نسل تک، نبوت کا یہ لازوال، ابدی، سرمدی (دائمی)، قیم (قیمتی) خزانہ منتقل ہوتا رہا اور اس وقت تک ہو رہا ہے، ہوتا چلا جائے گا، صرف یہی نہیں بلکہ ہر پچھلے (بعد والے) طبقہ میں تم دیکھو گے تو نبوت کے اس تجربہ کی گواہی ادا کرنے والوں میں اضافہ ہوتا رہا اور کیسا اضافہ؟ ایک اور دو کی نسبت سے نہیں، ایک اور تین کی نسبت سے نہیں، دوگنے اور تگنے کی حد تک کا اضافہ نہیں بلکہ بلا مبالغہ ایک اور لاکھ کی نسبت سے یہ اضافہ بتدریج بڑھتا رہا اور بڑھ رہا ہے، اور بڑھتا رہے گا، تا ایں (یہاں تک) کہ ساری نسلِ انسانی اس کی گواہ بن جائے۔

اور اسی تدریجی (درجہ بدرجہ) اضافہ کی نسبتوں کے ساتھ سلطنتوں کے پُرجلال پُرشوکت جلوہ بادشاہوں کی شاہانہ اور کڑے پہرے، علماء کی سخت ترین ماہرانہ چوکسی (نگرانی)، فقراء وصوفیہ [1] کی باوقار پُرعظمت نگرانی اور اُمت مرحومہ اسلامیہ کی فطری

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھو میری کتابیں: ''اسلام اور سلاطین اسلام'' ''اسلام اور علماء اسلام''، ''اسلام اور فقراء اسلام''۔

بیدار دماغی، طبعی ذکاوتِ حسی (ذہانت) کے حصار (گھیرے) میں صدیوں اور سالوں کا کیا ذکر ہے، بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے اور کہنا چاہئے، اس کے سوا جو کچھ کہا جائے گا جھوٹ ہوگا کہ ایک لمحہ ایک پل کے ادنیٰ ترین حصہ کے انقطاع (رُکنے) کے بغیر ٹھیک اسی آن بان، اسی سج دھج (خوبصورتی) کے ساتھ امت کے ان افراد کو ملتا رہا، اس وقت تک مل رہا ہے، جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض یاب نہیں ہیں، لیکن اسی کے ساتھ نہ ان کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک سیکنڈ کے لئے ان سے اوجھل ہوا اور نہ وہ اپنے رسول سے غائب ہوئے، سعادت صحبت (ساتھ رہنے کی سعادت) سے بہرہ مند (فائدہ اٹھانے والے) اگر کہہ سکتے تھے اور ان کو کہنے کا حق تھا کہ وہ اپنی نمازوں میں وہی پڑھتے ہیں جو ان کا رسول پڑھتا تھا (صلی اللہ علیہ وسلم)، وہ اسی طرح کھڑے ہوتے ہیں جس طرح وہ کھڑا ہوتا تھا، اسی طرح جھکتے ہیں جس طرح وہ جھکتا تھا، اسی طرح زمین پر پیشانی رکھتے ہیں جس طرح وہ پیشانی رکھتا تھا، توقسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ جن کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی، ہر قرن، ہر صدی بلکہ اس وقت بھی جہاں کہیں ہیں، قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھی وہی پڑھتے ہیں جو ان کا رسول پڑھتا تھا، اسی طرح کھڑے ہوتے ہیں جس طرح وہ کھڑا ہوتا تھا، اسی طرح جھکتے ہیں جس طرح وہ جھکتا تھا، اسی طرح زمین پر پیشانی رکھتے ہیں جس طرح وہ رکھتا تھا، سبھوں نے تو خدا کی تصویر کھینچی لیکن ایسا کون ہے جس کی بندگی کی تشکیل اسی طرح کی گئی۔

ہُو بہو، مِن وعَن جیسا کہ وہ تھا وہ متشکل (نقش) کیا گیا، کیا جا رہا ہے اور اس کامل یقین کے ساتھ کیا جا رہا ہے کہ اس کے ساتھ قطعاً وہ واقعات پیش نہیں آئے، جو پہلوں کے ساتھ پیش آئے، ہاں! جس طرح پہلوں کی کتب چھینی گئیں، ان کو ان کے

رسولوں اوتاروں ؎۱ سے جدا کیا گیا، کیا کوئی دکھا سکتا ہے ان کے ساتھ بھی سال دو سال کے لئے نہیں روز دو روز، گھنٹے دو گھنٹے، بلکہ سیکنڈ دو سیکنڈ کے لئے بھی (لا فعلہ اللہ-اللہ ایسا نہ کرے) ایسا واقعہ پیش آیا اور جس نے دنیا کے کسی گوشہ میں کبھی ایسا ارادہ کیا، کیا مسلسل نہیں دیکھا گیا کہ جس نے چھینا چاہا، وہی چھینا گیا؎۲ ،جس نے جدا کرنے کا خیال کیا، وہی جدا کیا گیا، یہی ہوتا رہا ہے، یہی ہوتا رہے گا، جس پر یہ گریں گے وہ بھی ٹوٹے گا، جوان پر گرے گا وہ بھی چکنا چور ہوگا، پھٹے ہوئے نہیں بلکہ تاریخ کے کھلے ہوئے مسلسل اوراق میں یہی لکھا ہوا ہے یہی لکھا جائے گا۔

بہرحال یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا تا ایں (یہاں تک) کہ بالآخر تاریخ کے اس عجوبہ طراز (انوکھے نقش نگار والے) عہد میں نسل انسانی داخل ہوگئی، جس میں ہر بعید وقریب ہر دور ونزدیک بلکہ شاید ہر غائب حاضر ہوگیا، مکانی فاصلے حذف ہوگئے اور وہی دنیا جو کبھی متعدد سمجھی جاتی تھی ایک دنیا بلکہ اگر کہو تو کہہ سکتے ہو کہ ایک بستی ہوگئی، زمانی مسافتیں کم ہوگئیں، بلکہ شاید زمانہ کی تین قسموں اور تین حصوں میں سے ایک حصہ ماضی کا تقریباً قابل ذکر نہیں رہا کہ اب جو گزرتا ہے وہ نہیں گزرتا ہے اور جو غائب ہوتا ہے حاضر رہتا ہے، وہی نہیں جنہیں دنیا میں کچھ اہمیت حاصل ہے بلکہ دنیا کی ادنیٰ سے ادنیٰ پیداوار جو کبھی پیدا ہونے کے ساتھ ہی مٹ جاتی تھی، وہ بھی اب اَنمٹ (نہ مٹنے والی) ہوگئی، قدرت نے اپنی پوشیدہ طاقتوں کا خزانہ پریس، تار، برق، لاسلکی، فون وغیرہ کی شکلوں میں فیاضی کے ساتھ

؎۱ اوتار (Avtar) کے معنی خدا کی جانب سے اتارا ہوا ہے، خدا یا دیوتا کا انسانی شکل میں آکر لوگوں کی اصلاح کرنا، مگر ہندو مت میں عموماً اوتاروں کو خدا (بھگوان) سے علیحدہ بشر نہیں بلکہ خود خدا ہی کا روپ قرار دیا جاتا ہے، یعنی بھگوان خود کسی شکل میں وارد ہوتا ہے۔ [م-ع-ا]

؎۲ ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے خوب ادا فرمایا ہے:

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے — پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

وقف عام فرمایا ہے۔

آخر آج کون گن سکتا ہے ان ذرائع اور وسائل کو جن کے ذریعے سے دنیا کے حوادثات وواقعات، تحریریں، تقریریں محفوظ ہو رہی ہیں، بزم وبازار میں آج یہ چیزیں ماری ماری پھرتی ہیں اور ہر اعلیٰ وادنیٰ کو میسر ہیں، آج کوئی ''امانت'' کی ''اندرسبھا''[1] اور شَرَر[2] کے ناول کو مٹا نہیں سکتا، پھر یہ اندیشہ اب کون کرسکتا ہے کہ تجربات کے ان ذخیروں کو اب دنیا کا کوئی حادثہ فنا کرسکتا ہے؟

ان ساز وسامان کے بعد کس قدر عجیب ہے اگر کہا جائے کہ جو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) عرب میں پیدا ہوئے تھے، وہ عرب ہی میں پیدا ہوئے تھے اور جس کی ولادت چھٹی صدی ہجری میں ہوئی تھی وہ چھٹی صدی میں ہی ہوئی تھی۔

اس زمانے کے جب غائب کو حاضر اور دور کو قریب سمجھا جاتا ہے، کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ پھر ان تمام غائبوں میں جو سب سے زیادہ حاضر اور ایسا حاضر کہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اتنا حضور ہم میں سے کسی کو خود اپنے سامنے نہیں ہے، ان تمام قریبوں میں جو سب سے زیادہ قریب اور اتنا قریب ہے کہ خود ہم اپنے سامنے اپنے کو اس قدر قریب نہیں پاتے۔

آخر ہم میں کون ہے، جس کے دماغ میں اپنی پیدائش، طفولیت (بچپن)، شباب (جوانی)، کہولت (بڑھاپا)، خلوت (پوشیدہ)، جلوت (اعلانیہ) کے تمام واقعات اور اس کے تمام پہلو اتنی صفائی کے ساتھ موجود ہوں جتنی تابناکی کے ساتھ دنیا اس شخص کے متعلق جانتی ہے جو اگرچہ آج سے صدیوں پہلے عرب میں ظاہر ہوا لیکن جس کے ظہور کی

---

[1] سید آغا حسن امانت لکھنوی (۱۸۱۶ء-۱۸۵۸ء) برصغیر میں اردو کے اولین ڈرامہ نگاروں میں سے ہیں، ۱۸۳۵ء میں امانت نے اردو زبان کا دوسرا ڈرامہ ''اندرسبھا'' لکھا، یہ اتنا مقبول ہوا کہ دوسرے شاعروں نے بھی اسی طرز کے منظوم ڈرامے لکھے۔ [م-ع-ا]

[2] برصغیر کے معروف ادیب وناول نگار عبدالحلیم شرر لکھنوی (۱۸۶۰ء-۱۹۲۶ء)

شدت ہر پچھلی (بعد والی) صدی میں پہلے سے زیادہ محسوس کی گئی، کی جارہی ہے، اور ان شاء اللہ ہمیشہ اسی بڑھتی ہوئی اشتدادی (سخت) کیفیت کے ساتھ محسوس کی جائے گی کہ قدرت نے اب جن سامانوں کو پیدا کیا ہے ان کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔

ختم نبوت

اور شاید کہ اس ہستی مبارک کے اسی غیر منقطع ارتقائی تسلسل کا نتیجہ ہے کہ اس کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ دُور اَز کار (بے کار) ہے، اس دعوے کا ہر مدعی فالتو، اور زمین کی پشت کا بالکل غیر ضروری بار (بوجھ) ٹھہرایا گیا ہے، چھٹی صدی کے بعد زمانہ کے ہر حصہ میں ٹھہرایا گیا، دنیا کے ہر خطہ میں ٹھہرایا گیا۔

اور جن بدبختوں کے دل میں کبھی اس منصب کی جھوٹی ہوک اٹھتی ہے یا اٹھوائی جاتی ہے، تم دیکھو! خلافِ دستورِ بنی آدم کتنی بدسلوکیوں کے ساتھ آخر وقت تک اس کو دُرِدُراتے (نکالتے)، دھتکارتے رہے، اٹھنے کو تو یہ اٹھ جاتے ہیں لیکن چند مغالطی پینتروں (دھوکے میں ڈالنے والی دلیلوں) کے بعد ہی ان کو خود یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے لئے دنیا میں کوئی کام نہیں، بنی آدم کی بستیوں میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، پھریوں ہی بازاری بیروزگاروں کی طرح بالآخر سرگردانی کے ساتھ بھٹکتے بھٹکاتے بہ ہزار حسرت و ناکامی، نامرادی کے گڑھوں میں ہمیشہ کے لئے مدفون ہو گئے، تاریخ اس کی شاہد ہے کہ بوالہوسیوں (ہوس پرستوں) کے بھپاروں (جھوٹ، فریب) سے بے چین و مدہوش ہو ہو کر اگر کوئی نبوت کا نام لے کر کبھی اٹھا بھی تو قدرت کے انہیں ہاتھوں نے جلتی گھانس کے خاکستر (راکھ) کی مانند اس کو وہیں بٹھا دیا، چودہ سو سال کا یہ تجربی مشاہدہ ہے[1] حالانکہ

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھو کتاب: ''ائمہ تلبیس'' از رفیق دلاوری۔

اس سے پہلے تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا کہ چار پانچ سال کے اندر کوئی نبی نہ آیا ہو، اس کی ضرورت نہ پیدا ہوئی ہو۔

اگرچہ کھلے کھلے صاف، غیر مبہم لفظوں میں بار بار اس کی منادی بھی کر دی گئی تھی اور نبوت ورسالت کے سلسلہ میں یہ پہلی منادی تھی کہ اب آسمان کا پیغام لے کر زمین والوں کے پاس کوئی نہیں آئے گا، یہی وجہ ہے کہ ختم نبوت کی اس سنگین مہر سے جو بھی ٹکراتا ہے، وہی پاش پاش ہو جاتا ہے اور قدرت کی چٹان پر سر مارنے کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔

بالفرض اگر یہ اعلان نہ بھی ہوتا جب بھی آخر دنیا کیا کرتی! آنے والے تو ہمیشہ اس وقت آتے ہیں، ان میں آتے ہیں، جب جانے والا جا ہی چکے، لیکن ایسا آنے والا جو اس شان کے ساتھ آیا کہ بجائے جانے کے وہ آگے ہی بڑھتا رہا، بڑھ رہا ہے، گنجائش ہی کیا ہے کہ اس کی جگہ دوسرا آئے۔

جس طرح وہ بھیجا گیا، جن صفات وکمالات کے ساتھ بھیجا گیا، اسی شان، اسی آن کے ساتھ چمکتے ہوئے آفتاب اور دمکتے ہوئے سورج کے مانند ہم میں وہ اسی طرح موجود ہے، ہر جگہ موجود ہے، ہر خطہ میں موجود ہے، اس کا وجود مغرب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح مشرق میں وہ آب وتاب کے ساتھ چمک رہا ہے، شاہوں کے قصور (محلوں) اور غریبوں کے قلب ہائے دیجور (اندھیرے دلوں) دونوں کو روشنی بانٹ رہا ہے اور یکسانی کے ساتھ بانٹ رہا ہے، وہ سب کے لئے برابر ہے، سب کے لئے یکساں ہے، وہ فضا میں بھری ہوئی ہوا ہے جس میں سب سانس لیتے ہیں اور وسعت کون ومکاں کا وہ نور ہے جس میں سب چلتے ہیں، پلتے ہیں، پھولتے ہیں، پھلتے ہیں، یقیناً اس کی ضرورت جتنی چھٹی صدی کے باشندوں کو تھی، اتنی ہی ضرورت اس وقت تک باقی ہے، پھر جب تک پیاس ہے، پانی چھلکے گا اور جب تک بھوک ہے روٹی معدوم نہ ہوگی، آخر اس وقت کیا تھا، جواب

نہیں ہے، یہ سچ ہے کہ دنیا اپنے خالق سے ٹوٹ کر اس زمانہ میں مخلوقات کے اندر غرق تھی، لیکن کیا آدم کی اولاد تباہی کے اس گِردَاب (بھنور مصیبت) سے نجات پا چکی؟

بلاشبہ جنہیں اس کی برکت میسّر آئی ہے، ان میں اکثروں کا، ان کا جو مرتد یا منافق نہیں ہیں ان کا بیڑہ خطرہ سے ان شاء اللہ نکل چکا ہے، لیکن کون کہتا ہے کہ سب کا نکل چکا ہے؟

پھڑ پھڑا رہے ہیں، ہندوستان کے ایک قطعہ اراضی میں اتنے پھڑ پھڑا رہے ہیں کہ ان کا شمار صدو ہزار سے نہیں بلکہ کروڑوں سے کیا جاتا ہے اور یہ تو صرف ہندوستان کا حال ہے، اس ملک سے باہر بھی کیا کام پورا ہو گیا ہے۔

آباد جزیروں کے اس جنگل میں جہاں آفتاب[1] نکلتا ہے اور مشرق کا وہ گنجان خطہ جہاں بنی نوع انسان کی سب سے بڑی آبادی ہے، کیا جاپان وچین کے ان باشندوں کی اپنے مالک سے صلح ہو چکی ہے؟ یقیناً ایک گروہ وہاں بھی ایسا پیدا ہو چکا ہے، جس نے مخلوقات کی بندگی کا جوا[2] (بوجھ) گردنوں سے پھینک کر حقیقی اور سچی زندگی حاصل کی ہے، لیکن کون نہیں جانتا کہ ان ممالک کی اکثریت بھی اسی طرح اپنے مالک سے روٹھی ہوئی ہے، جس طرح اس کے آباواجداد روٹھے ہوئے ہیں۔

غریب مشرق تو پس ماندگان (پیچھے رہ جانے والوں) کا ملک ہے لیکن جن کی پیش گامیوں (پیش قدمی، آگے بڑھنے) کا ڈھنڈورا اِس زور سے پیٹا جا رہا ہے، کیا یورپ کے ان باشندوں کی سمجھ سیدھی ہو چکی ہے "باپ بیٹے" کے قدیم افسانے کو تو چھوڑو لیکن جن

---

[1] جاپان کے معنی "مطلع الشمس" یعنی چڑھتے سورج کے پجاری کے ہیں، جو لفظ توپون کا ترجمہ ہے، اسی کی طرف اشارہ ہے۔

[2] گاڑی یا ہل کا وہ حصہ جو جتے ہوئے بیلوں وغیرہ کی گردن پر رہتا ہے۔ [م-ع-ا]

خلقتوں (تخلیق کردہ، بنائی گئی چیزوں) کی ایجاد وتخلیق کی انہیں توفیق بخشی گئی، بجائے توفیق بخشنے والے کے خود اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی ان مخلوقات کو اپنے دلوں میں نہیں بٹھائے ہوئے ہیں؟ یقیناً ان کے قلوب ان کی جدید مخلوقات کی انتہائی عظمت سے اسی طرح لبریز ہیں، جس طرح ان کے بزرگوں کے دل پرانی مخلوق کے احترام سے معمور تھے۔

پہلوں کی عقل کو سورج کی شعاعوں، آگ کے شعلوں نے خیرہ کیا تھا، تو کیا پچھلوں (بعد میں آنے والوں) کے سینوں میں برق کی قوتوں، اسٹیم کی طاقتوں، پیٹرول کی توانائیوں نے چکا چوند نہیں لگائی ہے، بزرگوں کے کارناموں، سورماؤں (بہادروں) کی اولوالعزمیوں (جرأت) نے اگر پہلوں کو ان بزرگوں کے پتھر کی کھودی ہوئی مورتیوں کے آگے جھکایا تھا، تو پچھلوں (بعد والوں) کے لیڈروں، زعیموں (سرداروں)، قائدوں کے کاموں نے ان کے اسٹیچو (مجسمہ) اور فوٹو کے ساتھ ان کی ساری قومی عزت وفلاح کو وابستہ نہیں کیا ہے؟

پرانوں کے دیوتاؤں کی گنتیوں کو سن کر تم قہقہے لگاتے ہو، ہنستے ہو، جب سنایا جاتا ہے کہ احمق ہندوستان خالق سے ٹوٹ کر چالیس کروڑ دیوتاؤں اور معبودوں کے ساتھ جکڑا ہوا تھا، مگر کوئی ہوتا جو ان نت نئے دیوتاؤں کی فہرست بناتا، جن کے ساتھ فرزانہ (عقل مند) و دانا یورپ کی روح اسی طرح خالق سے بیگانہ ہو کر ڈوبی ہوئی ہے، آخر بتایا جائے ان دونوں نئے اور پرانے طبقہ میں کیا فرق ہے، خالق سے یہ بھی دور وہ بھی دور، مخلوقات کے بوجھ سے یہ بھی چور وہ بھی چور (تھکے ہوئے)، کچھ فرق اگر ہے تو صرف اس قدر ہے کہ پرانوں کے معبود بھی پرانے تھے اور نئیوں کے معبود بھی نئے ہیں، پرانوں کو پرانے معبودوں میں عجائب وغرائب اور نت نئے فوائد نظر آئے تھے، اور نئیوں کو نئی مخلوقات میں عجائب وغرائب اور نت نئے فوائد نظر آئے، نظر آرہے ہیں، مظاہر احترام اور تعظیم کے بیرونی

قالبوں (شکلوں) کی خصوصیتوں سے اگر قطع نظر کرلیا جائے تو ناپ لیا جاسکتا ہے، اگر قلبی احساسات اور ذہنی کیفیات کے ناپنے کا کوئی آلہ ہوتا کہ پرانوں کے دلوں میں پرانے معبودوں کے متعلق جو کچھ تھا، نئیوں کے قلب میں نئے معبودوں کے متعلق وہی کچھ بلکہ شاید کہ اس سے زیادہ ہو۔

پرانے بھی تنہا خدا کے نام پر بپھر جاتے تھے، نئیوں کے سامنے جا کر آج خدا کو تنہا کیا بلکہ ان کے معبودوں کے ساتھ ملا کر بھی نام لو تو پھر دیکھو کہ ان کی پیشانی کی کھال کس طرح سکڑتی ہے اور منہ سے کتنے تولے کف (تھوک) کے اُڑ اُڑ کر بیچارے نام لینے والے کے چہرے پر پڑتے ہیں۔

تحریروں میں، تقریروں میں، گفتگوؤں میں، تذکروں میں، کیا نئیوں کا یہ گروہ اپنے معبودوں کے نام لئے بغیر کبھی گزر سکتا ہے، برق کا، بھاپ کا، تار کا، ریل کا، سیاروں کا، طیاروں کا، فیکٹریوں کا، ملوں کا، بینکوں کا، سرمایوں کا، ان کی مختلف شکلوں مثلاً انشورنسوں، ریسوں اور خدا جانے کن کن خداؤں کا نام آج جس دلچسپی کے ساتھ جس ذوق وشوق کے ساتھ لیا جاتا ہے مشکل ہے کہ خالق کے پوجنے والے نے اتنے ذوق وشوق کے ساتھ "بسم اللہ، الحمدللہ، سبحان اللہ، لا الہ الا اللہ" کا ذکر بھی کیا ہو۔

یہ حمد بھی کرتے ہیں تو ان ہی خداؤں کی، نعت بھی لکھتے ہیں تو ان ہی کی، پھر میں کیا غلط سمجھا، جب میں نے کہا ''جو پرانے تھے وہی نئے ہیں'' چند مخلوقات کے گرد پالتیاں مارے (امیروں کے انداز سے) وہ بھی بیٹھے تھے اور ٹھیک اسی طرح فطرت کے چند نوامیس (اصول) وقوانین کے تحت یہ بھی محو رقص، رامشگری (گیت گانے والے) ہیں، وہ ان کا بھجن (گیت) گاتے تھے، یہ ان کا شکر کرتے ہیں:

﴿أَتَوَاصَوْا بِهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ﴾

کیا وہ لوگ ایک دوسرے کو اسی بات کی وصیت کرتے رہے؟ (نہیں!) بلکہ وہ (سب) سرکش و باغی لوگ تھے۔

تم کہتے ہو کہ پہلوں نے انسانیت کو ذلیل کیا، جو سب سے اونچا تھا، وہ سب سے نیچا اور اسفل سافلین (سب سے زیادہ نیچے) کے درجہ پر پہنچایا گیا۔

بلاشبہ یہی ہوا، یہی ہونا بھی چاہئے کہ خالق ایک ہے اور مخلوق لامحدود ہیں، پس جس نے اس ایک کو چھوڑا، اس کو ہر ایک سے جڑنا پڑے گا، جو ایک سے نہیں ڈرے گا، اس کو ہر ایک سے ڈرنا پڑے گا، جو جھکنے ہی کے لئے ہے، اس کو جھکنا ہی پڑے گا، لیکن ایک کے آگے جھکا تو سب اس کے آگے جھکیں گے اور جس نے ایک کے آگے سر ٹیکنے سے انکار کیا، دیکھو! وہ ہر ایک کے آگے سر ٹیکنے پر مجبور ہے، ملائکہ کے آگے، جن کے آگے، انس کے آگے، حیوانات کے آگے، نباتات کے آگے، جمادات کے آگے اور میں کیا دکھاؤں کہ جو دیکھا نہیں جاسکتا اس کے آگے۔[1]

یہی وہ عذاب ہے جو آخرت سے پہلے ان کو دنیا میں چکھنا پڑا، چکھ رہے ہیں، برضا و رغبت چکھ رہے ہیں۔

مگر کیا انسانیت کی یہ توہین صرف پہلوں میں تھی، پرانوں نے خالق کے معبود ہونے سے انکار کیا، بے شک اس کے صلہ میں انہیں بندروں کو مسجود بنانا پڑا، لیکن جن لوگوں نے اپنے تئیں خدا کی مخلوق ہونے میں شک کیا تھا آج بندر کے مولود ہونے کا اپنی زبان سے کیوں اقرار کر رہے ہیں، جس نے بندر کو معبود بنایا کیا شبہ ہے کہ اس نے انسانیت کو رسوا کیا، لیکن جس نے خدا کی مخلوق ہونے سے انکار کر کے بندر کے مولود و مسعود ہونے پر فخر کیا، کتابیں لکھیں، دلائل قائم کئے، قائم کر رہے ہیں، کیا انسانیت کی خواری میں انہوں نے کوئی

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھو میری کتاب: "الطواغیت والأوثان"۔

کمی کی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہر چیز کی قیمت لگاتے ہوئے یکا یک چیخ اٹھتے ہیں کہ انسانیت کی کوئی قیمت نہیں ہے، سب انسان کے لئے ہیں، لیکن انسان کسی کے لئے نہیں، کسی مقصد کے لئے نہیں، کیا اس نے انسانیت کو ان عفونتوں (بدبو) اور غلاظتوں (گندگیوں) سے بدتر نہیں ٹھہرایا؟ جن سے انسانوں کے کتنے مقاصد وابستہ ہیں، جب انہوں نے کہا کہ انسان اپنے خدا اور خالق کے لئے نہیں ہے تو کیا اس کے بعد یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ انسان کسی کے لئے ہے بھی؟ پانی کا کیا بگڑے گا اگر آدمی نہ ہوں، ہوا کیوں رک جائے گی اگر آدمی نہ ہوں، آفتاب میں کیا داغ آئے گا اگر آدمی نہ ہوں، حتیٰ کہ سڑک کے کسی سنگریزہ (کنکر) اور جنگل کے کسی تنکے کا کیا نقصان ہے اگر کوئی نہ ہو؟ تمہارے بڑے نہ ہوں ،چھوٹے نہ ہوں، کوئی نہ ہو، بے شک سب ان کے لئے ہیں، لیکن مخلوقات کے اس طویل وعریض سلسلہ میں انسان کسی کے لئے نہیں، اب اگر وہ خالق کے لئے بھی نہیں ہے تو اس سے زیادہ عبث (بے کار) و بے نتیجہ، فضول و مہمل (بے فائدہ)، بے ہودہ ہستی اور کس کی ہو سکتی ہے؟ اس رُسوائی سے بڑی رُسوائی، اس ہتک (بے عزتی) سے بڑی ہتک (رُسوائی) اور کیا سکتی ہے۔

اور یہ تو ایمان کا حال ہے، عمل کے میدان ان جاہلوں کے پاس کیا تھا جو آج کے عالموں کے پاس نہیں ہے، عرب کے جہل نے کیا پیدا کیا تھا جو آج کے علم سے نہیں پیدا ہو رہا، جاہل شراب پیتے تھے، مردار کھاتے تھے، زنا کرتے تھے، سود خور تھے، جواری تھے، ایک کا خون دوسرا پیتا تھا، املاق (غربت) وافلاس کے اندیشہ سے لڑکوں کو، لڑکیوں کو د (قبر) میں زندہ دفن کر یتے تھے، یکن یہ قصہ کن کا سنایا جا رہا ہے، کیا عرب کے ہلوں کا یا یورپ کے عالموں کا، وہاں کیا دکھاتے ہو جیسے یہاں ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے، عرب سے باہر ایران میں ایک طرف "مزدک" زر، زمین، زن کو سب سے چھین

کرسب کودے رہا تھا[1]، اور دوسری طرف ''مانی'' اور اس کے شاگرد ہاتھوں میں استرے لئے پھرتے تھے کہ جس راہ سے یہ برائیاں آئی ہیں، ان ہی کا قلع قمع کر دیا جائے[2]، وہ انسانوں کو انسانوں میں آنے سے روکتے تھے، یہی ان کا فلسفہ تھا، لیکن یہ تو ایران میں ہو رہا تھا، آج یورپ کے ایک حصہ میں پھر وہی ''مزدک'' زندہ ہوکر ''بالشویک''[3] کے نام سے کیا وہی سب کچھ نہیں کر رہا ہے جو اس نے کیا تھا اور دوسری طرف ''برتھ کنٹرول'' کے نام سے اسی طرح انسانوں کو انسانوں کی سوسائٹی میں شریک ہونے سے روکا جا رہا ہے۔

---

[1] ''مزدک'' زرتشت کی طرح ثنویت کا قائل تھا یعنی کائنات میں فعال قوتیں دو ہیں، یزداں اور اہرمن ، اہرمن شر کی قوتوں کا نمائندہ جبکہ یزداں خیر کی قوتوں کا نمائندہ ہے، فطرت میں خیر و شر کی قوتوں کے مابین ایک مسلسل جنگ جاری ہے، اشیاء اچھی یا بری اس لئے ہوتی ہیں کہ وہ یا تو خیر کی قوت تخلیق کی پیداوار ہیں یا شر کی، نیز مزدک کے نظریات اشتمالیت پر مبنی تھے جو موجودہ اشتراکیت سے کہیں زیادہ برے تھے، اس کے نزدیک زر، زن، زمین سب انسانوں کی مشترکہ ملکیت تھیں، لہذا رشتہ ازدواج ان کے نزدیک ایک بے معنی شغل تھا، بہن، بھائی، زن و شوہر وغیرہ جیسے پاکیزہ رشتوں کو ان کے نزدیک کوئی تقدس حاصل نہ تھا، مرد بیک وقت کئی ایک عورتوں سے اور عورتیں بیک وقت کئی ایک مردوں سے جنسی تعلقات رکھ سکتی تھیں۔ [م-ع-ا]

[2] کہا جاتا ہے کہ ایران کا فرقہ مانویہ توالد و تناسل کے آلات ہی فنا کرنے کا وعظ کرتا تھا، اور اس کا خیال تھا کہ یہی دنیا کی ساری شرارتوں کا سرچشمہ ہیں، پس جو برائیوں کو روکنا چاہتا ہے چاہئے کہ وہ انسان ہی کو پیدا ہونے سے روکے۔

[3] ''بالشویک'' کمیونزم کا روسی نام، اس کا استعمال پہلی بار 1903 میں لندن میں منعقدہ روسی سوشل ڈیموکریٹک مزدور پارٹی کے اجلاس میں ہوا، اس میں کارل مارکس کے پیروؤں کو اکثریت حاصل ہوئی تھی، اس لیے ان کو بالشویک (اکثریت والے) کہا گیا، بالشویکوں کا لیڈر لینن تھا، بالشویک پارٹی کا مقصد کارل مارکس کی تعلیمات کی روشنی میں روس کے محنت کشوں کو انقلاب کے لیے منظم کرنا اور زار روس کی حکومت کا تختہ الٹ کر محنت کشوں کی حکومت قائم کرنا تھا تاکہ ملک میں سرمایہ داری نظام کو ختم کر کے اشتراکی نظام رائج کیا جائے، 1917ء کے انقلاب روس کے بعد بالشویک پارٹی کا نام روسی کمیونسٹ پارٹی (بالشویک) ہوگیا، یہی پارٹی سویت یونین کی بانی بھی ہے۔ [م-ع-ا]

ایک راستوں کو ڈھاتا اور دوسرا بند کرتا ہے اس کے سوا اور کیا فرق ہے؟ صحیح ہے کہ ہندوستان میں بدھ مت کے فلسفہ نفس کشی نے بڑی گندی شکلیں اختیار کی تھیں، ''دام مارگی'' پیدا ہوئے تھے، ''مانگ ودیا دام مارگی''[1] تک پائے جاتے تھے، اگھوری[2] ہونا آتما (روح) کی بڑی پاکی تھی لیکن آج صفائی کے مدّعی (دعوی کرنے والے) بن کر جو گندگیوں میں لت پت ہیں اگھوروں کو بھی قے ہو اگر ان کا حال سنایا جائے، بے پردگی وعریانی نے جنسی لذتوں کو جس حد تک بے جان کیا ہے، اس میں جان ڈالنے کے لئے آج مغرب کا اگھوری جو کچھ کر رہا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس کے سامنے مشرق کا اگھوری بھی شرمندہ ہے، الحاصل جو کچھ اس وقت تھا جہاں تک سوچو گے تقریباً کسی نہ کسی شکل میں تم اس وقت بھی اس کو پاؤ گے۔[3]

پس آنے والا کیسے جا سکتا تھا، جب تک کہ وہ سب نہ جائے جس کے لئے وہ آیا تھا، بلکہ اس کی ضرورت تو اس کے بعد بھی رہے گی کہ دنیا تو مسلسل محو تخریب (تباہ و برباد) ہے، لیکن کیا تعمیر بغیر معمار کے ممکن ہے، اور یہی میرا مقصد تھا، جب میں نے یہ کہتے ہوئے سب سے پہلے کہا تھا کہ یہی وہ آنے والا ہے جو آنے ہی کے لئے آیا، پھر جس طرح آج وہ ہم میں موجود ہے، اس کی ضرورت موجود ہے، ان سب کو دیکھ کر اب بھی کوئی شک کر سکتا ہے کہ آنے کے بعد وہ نہیں گیا اور جب تک اس کی ضرورت ہے، نہیں جائے گا، تھا! ہے! رہے گا! ابد تک رہے گا! اور اس کے لئے یہی مقدر ہے۔

---

[1] دیانند جی نے ستیارتھ پرکاش میں لکھا ہے کہ اس فرقہ کا عقیدہ یہ تھا کہ سب سے بڑی نیکی ماں کے ساتھ زنا کرنا ہے۔

[2] ''اگھوری'' ہندوؤں کا ایک مذہبی فرقہ جو مہادیو جی کے (عضو تناسل) کی شبیہ کو پوجتا ہے، مہادیو ہندوؤں کے تین سب سے بڑے خداؤں میں سے ایک ہے جسے شِو بھی کہتے ہیں۔ [م-ع-ا]

[3] تفصیل کے لئے دیکھو میرا مقالہ ''جاہلیت اولیٰ کا جاہلیت اخری سے موازنہ''۔

اللّٰهمّ صلّ وسلّم و بارك على سيدنا محمّد عبدك ورسولك النّبي و على اله و أزواجه و أمّهات المؤمنين و على ذرّيته وعلى المؤمنين والمؤمنات والمسلمين والمسلمات كما صلّيت وباركت على سيّدنا إبراهيم وعلى آل سيّدنا إبراهيم فى العالمين إنّك حميد مجيد.

فریضہ اُمتِ محمدیہ

پس اے اخوان (برادران) عزیز!

﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللهِ هُوَ مَوْلٰكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ﴾

''کوششیں کرو اللہ کی طرف بلانے میں کوشش کا پورا حق ادا کرتے ہوئے، اسی نے (اے امت اسلامیہ!) تم کو چن لیا ہے اور تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں فرمائی، یہ تمہارے باپ ابراہیم (علیہ السلام) کا دین ہے، اسی نے تمہارا نام مسلمین رکھا ہے، پہلے بھی اور اس میں بھی (کوشش کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا) کہ رسول تمہارے نگران رہیں گے، اور تم دنیا کے نگران رہو گے، پھر لوگو! نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور زور سے پکڑو اللہ کو، وہی تمہارا آقا ہے، پھر کتنا اچھا آقا ہے، کتنا اچھا مددگار۔''

جب تک جانے کے لئے آنے والے آتے رہے، اشخاص چنے جاتے تھے، لیکن جب وہ آیا جو آنے ہی کے لئے آیا تو اس کے طفیل میں اس کے ساتھ شخص نہیں بلکہ ایک

امت [1] ہی چنی گئی، پہلے شخص مبعوث (بھیجے ہوئے) ہوتے تھے اب ایک امت ہی مبعوث (بھیجی ہوئی) ہے، یہی اس امت کا ''اصل منصب'' اور ''فرض حقیقی'' ہے، جب تک وہ اس منصب پر قائم رہیں گے اور انسانوں کی نگرانی کریں گے اس وقت تک ان کے رسول بھی اس امت کے نگران رہیں گے لیکن جب تم اپنے منصب سے ہٹے، اگر رسول کی نگرانی کو نہیں محسوس کرتے ہو تو کیا یہی وعدہ نہیں تھا؟

یہ امت مجتبیٰ و مبعوثہ ہر قوم میں ہے، ہر ملک میں ہے، پس جو جہاں ہے، وہ وہیں مبعوث ہے، اس کی قوم اس ملک کے باشندے ہیں، مصیبت کی گھڑی وہی تھی جب اپنی قوم کو ہم نے اپنی قومیت سے نکالا، اسی کے ساتھ ان کا درد بھی دل سے نکلا، حالانکہ اگر حضرت نوح علیہ السلام کی منکران کی قوم تھی، حضرت ہود علیہ السلام کے کافران کی قوم تھی، قریش رسول خاتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے لوگ تھے، تو کس نے کہا کہ ہندوستان کے ہندو ہندوستان کے مسلمانوں کی قوم نہیں، مصریوں کی قوم مصر کے قبط نہیں، یورپ کے عیسائی یورپ میں رہنے والے ترکوں کی قوم نہیں پس جب تک:

﴿حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾

نہ ہو، تھک کر بیٹھنے والے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں، وثیقہ (عہد) ہے کہ:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾

''اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تا کہ

---

[1] نبی کے پیغام اور زندگی کے ہوتے ہوئے اگر زیادہ سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت ہے تو صرف یہی کہ لوگوں میں بد اعتقادی، بے عملی پیدا ہو جائے تو کوئی پھر کتاب وسنت کی طرف ان کو پلٹا کر لے جائے اتنے کام کے لئے ''امت مبعوثہ'' اور اس کے مجددین کافی ہیں اور کافی ہوتے رہے ہیں۔

سارے دینوں پر وہ غالب ہو۔''

اور دیکھو کہ لامذہبیت پر مذہبیت غالب ہے، چند پیشہ ور کتاب سازوں یا سبق فروش معلموں کو جانے دو جو ''وساوس بافی'' (وسوسہ گھڑنے) کی روٹی کھاتے ہیں، عام فطرتِ انسانی پر مذہب کی گرفت اسی طرح سخت ہے، جس طرح ہمیشہ سے تھی، آخر اگر لامذہبیت کا اسی قدر زور ہو گیا ہے تو جس یورپ کے متعلق یہ کہا سنا جاتا ہے وہاں کے باشندوں نے کیوں لامذہب ہونے کا اعلان نہیں کیا ہے۔

سچ یہ ہے کہ انسانی دماغ کی جو ذہنی ساخت ہے اس میں اتنی تنگی یا پستی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ ماضی و مستقبل کے انجام کے فیصلہ کے بغیر اپنی زندگی گزارے؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کہاں جا رہا ہوں؟ کیوں آیا ہوں؟ جس چلنے والے کے سامنے ان سوالات کے جواب نہیں ہیں، کیا وہ ایک قدم بھی آگے بڑھ سکتا ہے؟ بہر حال کم از کم اس وقت تک تو دنیا میں لامذہبوں سے زیادہ، بہت زیادہ، بہت ہی زیادہ تعداد مذہبی لوگوں کی ہے اور مذاہب میں ہر حیثیت سے جو وزن اسلام کو حاصل ہے، کسی کو نہیں ہے، پس اس کا منطقی نتیجہ کیا یہی نہیں ہوا کہ لامذہبیت پر مذہب غالب اور تمام مذاہب پر اسلام غالب اس لیے سب پر اسلام غالب ہے۔

جب مسلمان اپنی نگرانی دوسروں کے سپرد کر کے رسول اللہ ﷺ کی نگرانی سے اس وقت محروم ہیں، اس زمانہ میں بھی اسلام کے غلبہ کا یہ حال ہے، جب دنیا کے نگران بن کر پھر رسول اللہ ﷺ کی نگرانی کی سعادت مسلمان حاصل کر لیں گے تو کیا حال ہوگا، کچھ نہیں، کوئی کام نہیں، جب تک اصل کام نہ ہوگا، کسی کام میں کوئی برکت نہ ہوگی، بہت آرام لے چکے، تھکن مٹ چکی، کام بہت باقی ہے، ہوتا کہ چونکنے والے چونکتے اور ''درا'' کی اس

ضمیمہ نمبر ۲

عہد نبوی کے تمام شہدا، مقتولین، مجروحین اور اسیروں کی فہرست

کل تعداد	مقتول	زخمی	اسیر (قیدی)	نام فریق
387	259	127	1	مسلمان
7323	759	0	6564*	مخالف
7710	1018	127	6565	میزان

*6000 قیدی صرف غزوہ حنین کے ہیں، 6564 میں سے 6347 کو بلا شرط آزاد کر دیا گیا، صرف دو قیدی گذشتہ جرائم کی پاداش میں قتل کیے گئے۔

ہمدم 17/اپریل 1919ء نے جنگ عظیم از 1914ء تا 1918ء کی تعداد مقتولین یہ طبع کی ہے:

روس: 17 لاکھ　　جرمنی: 16 لاکھ　　فرانس: 13 لاکھ 70 ہزار

اٹلی: 4 لاکھ 60 ہزار　　اسٹریا: 8 لاکھ　　برطانیہ: 7 لاکھ 6 ہزار

ترکی: 2 لاکھ 50 ہزار　　بلجیم: 1 لاکھ 2 ہزار　　امریکہ: 50 ہزار

بلغاریہ، رومانیہ، سرویا و مانٹی ناگرو ایک ایک لاکھ: 4 لاکھ

کل میزان: 73 لاکھ 38 ہزار۔

زخمی، قیدی، گم شدہ ان کے علاوہ ہیں، ہندوستان اور فرانس و برطانیہ کی نو آبادیات بھی خارج ہیں۔

"النبی الخاتم" ایک گلدستہ عقیدت ہے جسے مولانا مناظر احسن کے عقیدت مند قلم نے سجایا ہے، اس میں مولانا نے اپنے خاص والہانہ رنگ میں سیرت پاک کے واقعات کو ایک خاص انداز وترتیب کے ساتھ پیش کر کے نہایت لطیف نتائج پیدا کیے ہیں۔ [مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ]

اگر انہیں مضامین کو عام نگارش کے طرز پر لکھا جاتا.......................تو ایسی کم از کم چار پانچ جلدوں میں یہی مضامین مشکل سے سماتے، جو حضرات اس کتاب کو صرف ایک نظر دیکھیں گے وہ شاید پورا اِستفادہ نہ کر سکیں گے اور نہ اچھی طرح لطف اندوز ہو سکیں گے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ گہری نظر سے اس کو ایک سے زیادہ مرتبہ دیکھا جائے، خود میں نے بھی اس کو دو مرتبہ بالاستیعاب اور بعض مقامات کو اس سے بھی زیادہ دفعہ دیکھا ہے اور ہر مرتبہ ''قند مکرر'' کا لطف اٹھایا ہے۔ [مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ]

میں نے اپنی ساری عمر میں سیرت نبوی میں............''النبی الخاتم'' سے زیادہ مؤثر کتاب نہیں پڑھی، کتاب پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف علم وانشاء پردازی کی کرشمہ سازی نہیں ہے، اس کے اندر ان کا سوزِ دروں اور خونِ جگر بھی شامل ہے اور واقعہ یہی ہے کہ:

رنگ ہو یا خشت وسنگ چنگ ہو یا حرف وصوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

[مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ]

سب سے دلچسپ اور البیلی کتاب جو ادبی انداز سیرت کا بہت عمدہ نمونہ ہے وہ برّصغیر کے ایک بزرگ مولانا مناظر احسن گیلانی کی ایک کتاب ہے، مولانا نے ''النبی الخاتم'' کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی تھی، اس میں نہ واقعات میں کوئی ترتیب ہے، نہ بظاہر اس میں کوئی نئی تحقیق ہے، لیکن پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا لکھنے والا دل کی دنیا میں بیٹھ کر ایک عجیب انداز سے لکھ رہا ہے۔

[ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمۃ اللہ علیہ]

راقم الحروف نے اسے بار بار پڑھا اور ہر بار نیا لطف محسوس کیا ہے، اس مختصر سی کتاب میں علوم و معارف کے دریا بند ہیں، زبان کی روانی، شوکت اور جوش وخروش کا تو یہ عالم ہے کہ بار بار پڑھ کر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پوری کتاب ایک ہی نشست اور ایک ہی دُھن میں لکھ دی گئی ہے، بلاشبہ یہ کتاب اردو کے علمی وادبی ذخیرے کی ایک قیمتی متاع ہے۔ [مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ]

زمزم پبلشرز
Urdu Bazar Karachi-Pakistan.
Ph: 0092-21-32760374
Fax: 0092-21-32725673
E-mail: zamzam01@cyber .net.pk
Website: www .zamzampublishers.com